انجمن

(ذاتی یادداشتوں اور تأثرات کا مجموعہ)

از

فقیر سید وحید الدین

پرنٹرز و پبلشرز

لائن آرٹ پریس (کراچی) لمیٹڈ

فریر روڈ - کراچی

باراوّل اپریل ۱۹۶۶ء ۳۰۰۰

قیمت
۱۵ روپے

ترتیب

شخصیات

تأثّرات

انتساب

ذاتی تاثّرات کے اس مجموعے کو میں

اپنی شفیق و مُحترم خالہ،

سیّدہ محبُوب بیگم

کے نام معنُون کرتا ہُوں

جن کی شفقت اور دعائیں میری زندگی اور آخرت کا سرمایہ ہیں

فقیر سیّد وحیدُالدّین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

یہ کتاب میرے مشاہدات اور تجربات کا ایک ایسا مُرقع ہے، جس میں متعدد کردار ہنستے بولتے نظر آتے ہیں۔ متضاد عادات، مختلف خصائل اور رنگا رنگ طبیعتوں کا میرے دل و دماغ نے کیا اثر قبول کیا، اس کی جھلکیاں "انجمن" میں ملتی ہیں۔ اس طرح یہ آپ بیتی، جگ بیتی بن گئی ہے۔

میں نہ تو ماہرِ نفسیات ہوں اور نہ کردار نگاری کا مُدّعی، بلکہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے یا محسوس کیا ہے، اُسے جوں کا توں کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔ یہ کتاب بعض ناقابلِ فراموش کرداروں کا عکسِ جمیل اور میری یادداشتوں کی بیاضِ سادہ و رنگین ہے۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہیں ہے کہ اچھے انسانی کردار انسانیت کی صحیح قدروں کے محافظ ہوتے ہیں، جن سے آئندہ نسلوں کے افراد اور معاشرے دونوں کو رہنمائی مل سکتی ہے۔

میں نے کسی انسان کی زندگی کا مطالعہ اُسے فرشتہ سمجھ کر نہیں کیا،

لغزش و خطا سے کوئی انسان محفوظ نہیں ہے۔ میں نے سیرت و کردار کے چمن زاروں سے خار و خس کو نظر انداز کر کے پھول چُننے کا اِلتزام کیا ہے، اور انھیں پھولوں سے اس "انجمن" کو سجایا ہے۔

"انجمن" کی ترتیب و اشاعت کا بنیادی مقصد آج کل کے نوجوانوں کی اِس غلط فہمی اور خوش اندیشی کو آئینہ دکھانا ہے کہ وہ عصرِ حاضر کی تہذیب —— Civilisation کو ترقی یافتہ تہذیب سمجھے ہُوئے ہیں۔ اِس موقع پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قارئینِ کرام پہلے ان صاحبِ کردار لوگوں کے واقعات کا بغور مطالعہ فرمائیں۔ پھر اپنے گرد و پیش اور ماحول کا جائزہ لیں اور اس امر کا موازنہ کریں —— کہ

کیا تہذیبِ حاضر واقعی ترقی کی راہ پر گامزن ہے؟

یا

فرد اور سوسائٹی کی اَخلاقی پستی نے اُسے آمادۂ زوال اور انحطاط پذیر کر رکھا ہے؟

"انجمن" آپ کو اس سوال کا جواب دے سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری کوشش رائگاں نہیں گئی۔

فقیر سید وحید الدین

"الفقیر"

۲۷ سی، گلبرگ، لاہور

۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولٰنا الطاف حسین حالی

مولٰنا حالی پانی پتی کا ایک شعر ہے:

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُس کی

وُہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

مولٰنا مرحُوم نے یہ شعر کسی دُوسرے کے لیے کہا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ خود اُن کی ذات اور شخصیت اس شعر کا مصداق تھی۔ وہ اپنی ذات سے علم و فضل کی انجمن واقع ہُوئے تھے۔ میرے والد فقیر سیّد نجم الدین مرحُوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ وحید! تمھیں اپنی خوش قسمتی کا اندازہ نہیں ہے۔ اس مسرّت کا حال کوئی میرے جی سے پُوچھے، ارے میاں! تم تو مولٰنا حالی جیسی عظیم و عالی مرتبت شخصیت کی گود میں کھیلے ہو۔ قسمت والے بچّوں ہی کو فخر و سعادت کے ایسے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

والد صاحب مرحُوم اِس تفصیل کو اتنی دلچسپی کے ساتھ مزے لے لے کر

بیان کرتے کہ ان کا کہا ہوا ایک ایک لفظ دل میں اُترتا اور خود بخود حافظے میں محفوظ ہوتا چلا جاتا۔ ۱۹۰۵ء-۰۴ جسے اب ساٹھ سال ہونے کو آرہے ہیں، اُس زمانے میں میری عمر بہت سے بہت ایک یا ڈیڑھ سال کی ہوگی، والدِ بزرگوار سرکاری ملازمت کے سلسلے میں پانی پت میں تعینات تھے، مولینا حالؔی سے اُن کے نیازمندانہ روابط کا جو آغاز ہُوا ہے تو پھر یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پایا۔ والد صاحب کی نیازمندی اور مولٰینا مرحوم کی کرم گستری میں اضافہ ہی ہوتا رہا روزانہ ملاقات رہتی۔ اکثر و بیشتر تو مولٰینا خود ہمارے گھر تشریف لاتے۔ مجھے دیکھتے ہی گود میں اٹھا لیتے اور پیار کرتے۔ رفتہ رفتہ یہ شفقت اتنی بڑھی کہ صبح کے وقت جب دھوپ اچھی طرح پھیل جاتی، مولٰینا حالؔی ہمارے گھر تشریف لاتے اور مجھے گود میں لے کر اپنے مکان واپس تشریف لے جاتے۔ شام تک میں اُنھی کے گھر میں رہتا۔ پھر وہ دن چھپنے سے پہلے مجھے میرے گھر پہنچا دیتے۔ تقریباً دو سال والدِ مرحوم پانی پت میں مقیم رہے۔ مولٰینا کی اس وضعداری اور معمول میں فرق نہ آیا۔ اس زمانے کا اب میں تصوّر کرتا ہوں تو عہدِ رفتہ کے بزرگوں کی وضعداری اور خُورد نوازی کا عجیب سماں نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کیسے شریفُ النّفس لوگ تھے۔ کیا پیار، محبّت، بے نفسی اور ملنساری کا زمانہ تھا۔ والد مرحُوم کی اِس گفتگو کا تصوّر کرتا ہُوں تو عجیب سا کیف محسوس ہوتا ہے اور یہ آج کا زمانہ جب پچھلی یادداشتیں حافظے سے کاغذ پر منتقل کی جارہی ہیں، کیا سے کیا ہوگیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اگلے زمین و آسمان ہی بدل گئے

ہیں اور آج سائنس کی ایجادات کے ہجوم میں سب سے زیادہ قحط پیار، محبّت، وضعداری اور بھائی چارے کا نظر آتا ہے۔

والد مرحوم نے بتایا کہ مولٰینا حالیؔ نے تمھارا پیار کا نام "مُلّا ہانڈہ" رکھا تھا اور اِسی نام سے وہ تمھیں پکارتے اور اِس نام میں جو تفنّن کا پہلو ہے' اس سے خوب لطف اٹھاتے۔ یہ لطیف مزاح اور خوش طبعی اُن کی سنجیدگی کو زیب بھی دیتی تھی۔ والد صاحب جب دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گھر آتے تو مجھے وہاں موجود نہ پاکر سمجھ جاتے کہ مولٰینا اپنے معمول اور وضعداری کے مطابق مجھے اپنے گھر لے گئے ہوں گے! مگر ایسا بھی ہوا کہ دو تین دن متواتر اُنھوں نے مجھے دوپہر کے وقت گھر پر موجود پایا' انھیں خیال ہوا کہ شاید مولٰینا نصیبِ دُشمناں' بیمار ہو گئے ہیں۔ اِس لیے والدِ مرحوم مولٰینا کے دولت کدے پر مزاج پُرسی کے لیے پہنچے۔ مولٰینا اللّٰہ کے فضل سے خیریت سے تھے اور ہشّاش بشّاش تھے۔ والد صاحب نے اپنی حاضری کی وجہ بتائی۔ اس پر مولٰینا نے فرمایا کہ مَیں دِلّی گیا ہوا تھا۔ وہاں چند نوجوانوں نے مشاعرہ منعقد کیا تھا اور میری شرکت کے لیے اُن کا اصرار اتنا بڑھا کہ مجھے دِلّی جانا پڑا۔ یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُس زمانے میں مشاعرے منعقد کرنے کا خاص انداز تھا۔ وسیع و عریض فرش پر سفید چاندنی بچھائی جاتی، گاؤ تکیے لگتے۔ سامعین کے درمیان ایک شمع روشن ہوتی، جو باری باری ہر شاعر کے سامنے لے جائی جاتی۔ شمع قریب رکھنے کا مطلب یہ ہوتا کہ سامعین اب اس شاعر کا کلام سُننے کے لیے ہمہ تن گوش

ہیں۔ شاعر حضرات بھی مُشاعروں میں اس اہتمام سے آتے، جیسے کوئی بڑی تقریب مسرت ہے، بیاضیں ساتھ ہوتیں اور اساتذہ قسم کے شاعر اپنے شاگردانِ رشید کے جلو میں تشریف لاتے، جہاں مُنتظمین انھیں حسبِ مراتب بٹھانے کا اہتمام کرتے، یہ بھی کچھ اسی قسم کا مشاعرہ تھا۔ مولینا نے دِلّی کے اِس طرحی مشاعرے کی رُوداد بیان فرماتے ہوئے کہا کہ نوجوانوں نے بڑے سلیقے کے ساتھ بزمِ شعر وسخن برپا کی تھی۔ مجھ سے اشعار پڑھنے کے لیے کہا گیا تو میں نے معذرت کے لہجے میں کہا، میں شاعرانہ تکلّف سے کام لوں گا۔ نہ غلط بیانی کروں گا۔ تازہ غزل تو میں لایا ہوں، لیکن یہ نوجوانوں کی محفل ہے۔ زیادہ مناسب یہی ہے کہ آپ اپنا کلام سُنائیں۔ مجھ بوڑھے شاعر کو معاف فرما دیں۔

اِس پر نوجوان طلباء نے بڑا اِصرار کیا کہ نہیں حضرت! آپ بزرگ ہیں آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر، مگر شعر و شاعری کے معاملے میں آپ کو ہماری گزارش ماننی پڑے گی۔ مولینا نے فرمایا کہ ان لوگوں کا اِصرار اتنا بڑھا کہ مجھے غیر طرحی غزل سنانی پڑی۔ لیکن میری غزل سننے کے بعد دوسرے تمام شعراء نے اپنی اپنی غزلیں پڑھنے سے اِنکار کر دیا اور کہا کہ مولینا کا کلام سُننے کے بعد ہم اپنے اشعار پڑھنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔

مولینا جب یہ واقعہ سُنا رہے تھے تو اُن کے لہجے سے کسرِ نفسی اور انکسار کی تراوش ہو رہی تھی۔ لیکن والد صاحب نے اندازہ کر لیا کہ بزرگوں کی وضعداری کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ دوسروں کی بڑائی تسلیم کرنے میں بُخل سے

کام نہ لیں۔ اِس مشاعرے میں شریک ہونے والے شعراء نے یہ فیصلہ کر کے خود اپنی بڑائی کا ثبوت دیا کہ مولیٰنا حالیؔ جیسے بزرگ شاعر کی مُرصّع غزل سُننے کے بعد اپنے اشعار کو بے مایہ سمجھا اور انھیں پڑھنے کی جرأت نہیں کی۔

مولیٰنا نے پھر وُہ غزل والدِ مرحُوم کو سُنائی جو انھیں سُنتے ہی یاد ہو گئی۔ میرے والد اِس واقعے کو اکثر مزے لے لے کر بیان کرتے اور غزل بھی دُہراتے، حتّٰی کہ یہ میرے حافظے پر بھی نقش ہو گئی۔

ہوئی رعیانِ جوانی کی بہار آخر حیف
طبع رنگیں تھی مے ٔ عشق کی جب متوالی

اپنی رُوداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

اب کہ اُلفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ
سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی

گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وُہ مضمُون سجھانے والی

آپ بیتی نہ ہو جو وُہ ہے کہانی بے لُطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی

ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

کھینچیے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصوِیر

کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقالی

تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کی طرح

وُہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہُوا ہے خالی

پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وُہی ہو نہ مثل

"قحبہ چُوں پیر شود پیشہ کُند دلّالی"

والدِ بزرگوار مولٰینا حالؔی مرحُوم کی شخصیت اور ذات سے محبت ہی نہیں عقیدت بھی رکھتے تھے۔ اُن کا ذکر جب بھی کرتے، مؤدّبانہ لہجے میں کرتے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میں نے مولٰینا سے یہ غزل سُنی بھی اور اُن کی آواز کو محفوظ کرنے کا بندوبست بھی کیا۔ اُن دنوں گلاسوں والا گراموفون ریکارڈر آتا تھا۔ میں نے مولٰینا کی زبان سے اُن کے اشعار ریکارڈ کرنے کی جُرات بلکہ گُستاخی کی۔ مولٰینا کا کرم تھا کہ میری اِس جُرأت کو اُنھوں نے گوارا کرلیا، مگر وحید! اِس کا افسوس ہے کہ تمھارے لاابالی پن نے اس سرمایے کو محفوظ نہ رہنے دیا۔ تمھاری جوانی کی ترنگ اور غفلت کے سبب آیندہ نسلیں اُس عظیم المرتبت شخصیت کی آواز سُننے سے محرُوم ہوگئیں۔

ہمارے خاندان میں اولادِ نرینہ کی کمی تھی۔ اِس لیے گھرانے کے لوگ مجھے بہت چاہتے تھے اور اُن کی تمنّا رہتی تھی کہ مَیں لاہور آتا جاتا رہُوں۔ والدِ مرحُوم کا بیان ہے کہ مولٰینا حالؔی کو تُم سے اس قدر اُنس اور تعلقِ خاطر ہو

گیا تھا کہ اُن کے مشورے اور اجازت کے بغیر تمھیں پانی پت سے لاہور بھیجنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی۔ مولٰینا اجازت تو دے دیتے مگر خوش دلی سے نہیں۔

یہ واقعہ بہ ظاہر معمولی اور سادہ ہے۔ اس میں کوئی ندرت اور اعجوبیت نظر نہیں آتی، لیکن اس کے پس منظر میں یہ حقیقت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے کہ اچھّے بزرگوں کی آغوشِ محبت اور سایۂ تربیت نعمتِ خداوندی ہوتا ہے اور یہ نعمت جنھیں میسّر ہو اور وُہ اس سے صحیح فیض نہ اُٹھا سکیں۔ وُہ اپنی محرُومیِ قسمت پر جتنا افسوس کریں، کم ہے۔ اپنے متعلق اکثر سوچ کر افسُردہ ہوتا ہوں کہ کم سنی کے باعث مولٰینا کی شخصیّت اور عظمت کا اندازہ نہ کر سکا اور نہ اس صاحبِ کمال بزرگ کے علم و فضل سے میری کم سنی خوشہ چینی کر سکی۔ اور جب میرے شعور و احساس کی کلیاں چٹکیں تو قوم کے دلوں کو گرمانے اور اُس کے دماغوں کو روشن کرنے والی یہ شمع ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

سیّد ناظر حسین ناظمؔ

اصل نام سیّد ناظر حسین، تخلص ناظمؔ۔ اپنے زمانے کے واعظ خوش بیاں، شاعرِ رنگیں نوا اور ممتاز مرثیہ گو تھے۔ مَیں نے انھیں اپنے بزرگوں کی رفاقت میں اچھی طرح دیکھا ہے اور ان کا کلام خود ان کی زبانی سنا ہے سنہ ۱۹۱۸ء میں "مرثیہ نامہ ناظمؔ" کے نام سے ان کے اشعار کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا اُسے بھی دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ ناظمؔ مرحوم جب ترنّم کے ساتھ اپنا کلام سناتے تو سماں بندھ جاتا۔

بازار حکیماں میں ہمارے قریب ہی اُن کا مکان تھا۔ علم مجلسی میں طاق تھے۔ بذلہ سنج اور ساتھ ہی تجربہ کار اور جہاں دیدہ بھی۔ بزرگوں کی محفلوں کے وُہ رُوح رواں تھے۔ وہ نہ ہوتے تو اُن کے ہم نشیں محفل میں بڑی کمی محسُوس کرتے۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح زندگیاں انتہائی مصروف اور کاروباری بن کر نہیں رہ گئی تھیں۔ بزرگوں کی مجلسیں باقاعدگی کے ساتھ جمتیں۔ ناظمؔ مرحُوم

کو جب میں نے پہلی بار دیکھا ہے تو میری عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔ ناظمؔ مرحوم کا حلیہ اب تک میری نگاہوں میں اِس طرح محفوظ ہے جیسے وہ میرے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ سُرخ و سپید رنگت۔ کھڑا ناک نقشہ۔ گھنی ڈاڑھی۔ دراز قد اور زلفیں شانوں تک بکھری ہُوئیں۔ آبائی وطن مظفر نگر تھا، لیکن میرے بزرگوں سے دوستانہ مراسم اتنے بڑھے کہ نقلِ وطن کر کے لاہور آ گئے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔ ہمارے یہاں عاشُورہ کے ایّام میں ہر روز باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ مجالس کا انعقاد و اہتمام ہوتا۔ یہ وہ قدیم روایت ہے جو اب تک ہمارے خاندان میں چلی آتی ہے۔

ناظمؔ مرحوم کا یہ معمول تھا کہ ہر سال اپنا نو تصنیف مرثیہ مجالس میں پڑھتے اُن کے مرثیے کی خاصی دُھوم تھی، جسے دُور و نزدیک علاقوں کے شرفاء بڑے شوق کے ساتھ سُننے کے لیے آتے۔ مرثیہ پڑھنے کا انداز دیدنی تھا۔ لڑائی کا ذکر آتا تو گھوڑے، تلوار، جنگ کی صف آرائی وغیرہ کو اس طرح بیان کرتے کہ سچ مچ جنگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ مرثیہ پڑھتے ہُوئے جب انگرکھے کی آستین اُلٹتے تو ایسا لگتا کہ سُننے والوں کے دلوں کو اُلٹے دے رہے ہیں۔ ایک بار مجلس میں مندرجہ ذیل قطعہ پڑھا اور عقیدت مندانِ اہلِ بیت سے خراجِ تحسین و ستائش حاصل کیا:

کرتے ہیں کارِ خُدائی بھی خدائی میں بشر
کعبۂ حق کی ہُوئی تعمیر اُن کے ہاتھ پر!

ہے ۔ مجھے تو اِس کی سادگی، کہنے والے کا خلوص اور اللہ تعالیٰ کی شانِ رزّاقی اور رحمت پر شاعر کا یقین اور اعتماد پسند ہے ۔ شعر کے یہی تیور میرے دل میں کھُب گئے ہیں ۔

ناظمؔ مرحوم کی برجستہ شعر گوئی کا ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے ۔ اُسے بھی لگے ہاتھوں سُن ہی لیجیے کہ نہ جانے پھر یہ فرصت مُیسّر آئے کہ نہ آئے ۔

میرے نانا فقیر سیّد افتخارُالدّین برطانوی حکومت کی طرف سے سفیر ہو کر افغانستان گئے ۔ امیر حبیبُ اللہ خان والیِ کابل کا زمانہ تھا ۔ فقیر افتخارُالدّین تین سال وہاں مقیم رہے اور اِس دوران میں سیاسی و سرکاری روابط کے ساتھ امیر حبیبُ اللہ خان سے ذاتی تعلّقات بھی اُستوار ہو گئے ۔ سرکاری فرائض انجام دینے کے بعد جب وہ لاہور واپس آ گئے تو امیرِ موصُوف نے ازراہِ خلُوص و دوستی اور بہ طرزِ قدر شناسی اُنھیں اپنی ایک جاذبِ نظر تصویر بھیجی، مگر تصویر اُن کے دستخطوں سے خالی تھی ۔ اور اس تحفۂ خلُوص میں تشنگی سی محسُوس ہوتی تھی ۔

فقیر افتخارالدّین مرحُوم نے مولانا ناظمؔ کو بُلایا ۔ والیِ کابل کی عنایت کی ہُوئی تصویر دکھائی اور مشورے کے انداز میں پُوچھا : آپ نے دیکھا ، امیر حبیبُ اللہ خان کے دستخط اِس پر نہیں ہیں ۔

ناظمؔ مرحُوم نے اِس پر کہا کہ تحفے میں جو تِشنگی اور کمی رہ گئی ہے ، اُس کے اظہار کا جو پیرایہ میرے ذہن میں آیا ہے ، وُہ یہ ہے کہ مَیں ایک فارسی

قطعہ کہے دیتا ہُوں۔ آپ کسی فن کار خوش نویس سے کتابت کرا کے شاہ کی خدمت میں ارسال کر دیں۔ اِس طرح وہ آپ کے دلی مقصد سے مطلع ہو جائیں گے۔ نانا مرحوم نے ناظمؔ صاحب کی اِس تجویز کو بہت پسند فرمایا۔ چلتے وقت اُن کو بتایا کہ امیر حبیبُ اللہ خاں کی مُہرِ شاہی پر

"سراجُ المِلّت والدّین"

کندہ ہے اور یہ لقب اور خطاب انھیں بہت محبوب ہے۔

چند دن کے بعد ناظمؔ مرحوم فارسی کا یہ قطعہ لے کر تشریف لائے:

شہ کو ہست جانِ عالمے تمثالِ تصویرش
سراجُ المِلّت والدّین باشد مُہرِ تنویرش
میسّر دولتِ دیدارِ شاہی در فقیری شُد
کہ دارم افتخارِ دیدِ خط و خالِ تحریرش

یہ قطعہ ایک خوش رقم خطّاط نے دیدہ زیب انداز میں چمکتے ہوئے سفید دبیز کاغذ پر لکھا۔ اُس کے چاروں طرف سُنہری بیل بنوائی گئی۔ پھر اس قرطاسِ مُطلّا کو سلیقہ کے ساتھ شاہ کی خِدمت میں افغانستان بھیجا گیا —— امیر حبیبُ اللہ خاں قطعہ پڑھ کر اُس رَمز اور حُسنِ طلب کو سمجھ گئے، جو اس قطعے کے بھیجنے میں کارفرما تھا۔ اُنھوں نے تصویر پر اپنے دستخط کیے اور تصویر واپس بھیج دی۔ شاہِ افغانستان کی دستخط شدہ یہ تصویر ہمارے خاندان میں عرصے تک محفوظ رہی۔

امیر حبیب اللہ خاں کی وضعداری اور مُستقل مزاجی کی ایک جھلک یہ ہے کہ جب میرے نانا فقیر سیّد افتخارالدین نے داعیِ اجل کو لبّیک کہا تو امیر موصُوف نے جلال آباد (افغانستان) سے ایک تعزیتی وفد لاہور بھیجا، جس نے مرحُوم کے گھر جا کر پسماندگان کو پُرسا دیا اور شاہ کی جانب سے اظہارِ ہمدردی کا پیغام پہنچایا اور دُعائے مغفرت بھی کی ___ مگر۔ آہ ___ آج کی دُنیا، جہاں زیادہ تر تعلّقات کا انحصار ذاتی اغراض پر ہوتا ہے، لوگ عُہدوں اور مال و دولت سے پہچانے جاتے ہیں، اقتدار و عُہدہ کے رخصت ہوتے ہی تعلقات و روابط اور تعارُف و شناسائی کی بساط بھی لپیٹ دی جاتی ہے جیسے اُن کا وجُود ہی نہ تھا۔

ناظمؔ مرحُوم بھی ایک وضعدار انسان ہونے کے علاوہ دوستوں کے پکّے اور بے لوث دوست تھے۔ اُنھوں نے جس سے بھی تعلّقات قائم کیے، انھیں آخر دم تک پُوری طرح نبھایا۔ دوستوں کی اولاد اور اپنی اولاد میں ذرّہ بھر فرق نہ سمجھا۔ دوستی کا مطلب غالباً اُن کے نزدیک دوست کے لیے مِٹ جانے اور قربان ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ایک موقع پر اُن کے ایک عزیز دوست میر سردار حسین، جاگیردار بانساں والا کے اکلوتے فرزند مقبول حسین جب مرض الموت میں مبتلا ہُوئے تو میر ناظمؔ نے کمال حوصلہ مندی سے بارگاہِ خداوندی میں یہ دُعا کی:

”اے خُدائے بزرگ و برتر! میرے دوست کا

ایک ہی بیٹا ہے۔ وُہ بھی بسترِ مرگ پر ہے۔ تو نے اپنی
رحمت سے مجھے دو فرزند عطا کیے ہیں۔ اے اللہ! میرے
اِن دونوں فرزندوں میں سے کسی ایک کی زندگی میرے
دوست کے فرزند کو عطا فرما دے۔ مَیں ناانصافی نہیں چاہتا
اِس طرح میرے پاس بھی ایک بیٹا رہے گا اور میرا دوست
بھی بے فرزند نہ رہے گا۔ تو ہر شے پر قادر ہے''۔

کیفیت یہ تھی کہ قرآنِ کریم ہاتھوں پر رکھا اور رات سے لے کر صبح تک ننگے سر، ننگے پاؤں آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر دُعا کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے نیاز ہے اور اُس کے نظامِ مشیّت میں اِنسانی خواہشات کا کیا دخل۔ ناظمؔ صاحِب کی یہ التجا بارگاہِ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل نہ کرسکی اور آفتاب طلوُع ہوتے ہی میر سردار حسین کا لڑکا مقبول فوت ہوگیا۔

مگر اس واقعے سے ناظمؔ مرحُوم کا خلوُص صفحۂ ہستی پر ثبت ہو کر رہ گیا۔

ناظمؔ مرحُوم کے مشاغلِ زندگی کے سلسلے میں یہ بتانا دِلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اُنھوں نے ''ناظم الھند'' کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا اور سالہا سال اُسے باقاعدگی سے شائع کرتے رہے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے نواب صاحب بہاول پُور کے متعلق ایک مضمون شائع کیا، جو

ریاست بہاول پور کے سرکاری حلقوں میں قابلِ اعتراض سمجھا گیا اور ناظم مرحوم پر مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ ازالۂ حیثیتِ عرفی کے اس مقدمے میں ناظم صاحب کو سزا ہو گئی اور اُنھیں جیل بھیج دیا گیا۔ اِس فیصلے کے خلاف اُن کے قانونی مُشیروں نے عدالتِ عالیہ میں اپیل دائر کر دی۔ ناظم مرحوم کے خاندان میں یہ واقعہ اب تک مشہور ہے کہ اُنھوں نے اپنا مذکورہ مجمُوعہ مرثیہ نامۂ ناظم اِسی دورِ اسیری میں مکمّل کیا اور حُسنِ اتّفاق دیکھیے کہ جس روز یہ مرثیہ نامہ مرتّب ہو کر مکمّل ہُوا، ٹھیک اُسی دِن ناظم مرحُوم کی رہائی کا پروانہ جیل خانے پہنچا۔ ناظم مرحُوم نے باعِزّت رہائی پر خُدا تعالیٰ کا شُکر ادا کیا اور مسرُور و مطمئن گھر واپس آ گئے۔

اِمتدادِ زمانہ سے ناظم مرحُوم کا بہُت سا کلام اور قیمتی مضامین کا ذخیرہ ضائع ہو چکا ہے۔ مذکورہ دِیوان اُن کے ایک مخلص دوست شیخ سراج الدین مرحُوم پبلشر کشمیری بازار لاہور نے محض دوستانہ جذبے سے خُود شائع کرایا تھا۔ اب اِس کے نسخے نایاب ہیں۔

ناظم صاحب کی وفات اِس اعتبار سے بہُت حسرت ناک تھی کہ پس ماندگان میں اُنھوں نے غم رسیدہ بیوہ کے علاوہ دو کم سِن بچّے شاہجہاں حسین اور مقصود حسین چھوڑے، جن میں سے آخرُالذکر لڑکے کو مرحُوم کے ایک جگری دوست نے پرورِش کے لیے مرحُوم دوست کی نشانی کے طور پر لے لیا۔

ناظم اور اُن کی رفیقۂ حیات کے درمیان کس قدر گہرا رُوحانی اور قلبی

تعلّق تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس عجیب وغریب مثال سے ہو سکتا ہے کہ جس دن اقارب، احباب، غم زدہ ہمسائے اور واقف کار ناظمؔ مرحُوم کے چالیسویں میں شریک تھے اور ہر ایک کی آنکھ اُس صاحبِ کردار اور صاحبِ علم بزرگ کی ابدی جُدائی کے غم میں پُرنم تھی۔ ٹھیک اُسی دن مرحُوم کی بیوہ نے داعیِ اجل کو لبّیک کہا اور خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں اپنے مہربان و مُحب شوہر سے جا ملی۔

حکیم امینُ الدّین

میرے والد کے حقیقی ماموں اور حکیم حسامُ الدّین کے اکلوتے بیٹے، حکیم امینُ الدّین، اپنے زمانے کی مُمتاز شخصیّتوں میں شمار ہوتے تھے۔ بازار حکیماں میں اُن کا مکان تھا۔ اُس عہد میں خاندان کے بہُت سے لوگوں کا ایک ہی محلّے میں قریب قریب رہنا ایک مستقل روایت اور دستُور بن گیا تھا، اِسی لیے اُن بزرگوں میں ایک دُوسرے کے لیے ہمدردی اور غم خواری کے جذبات پائے جاتے تھے۔ ذرا کسی کا کان بھی گرم ہو جاتا تو مزاج پُرسی کے لیے عزیزوں کی آمد کا تانتا بندھ جاتا۔ آج کل رہنے سہنے کی وُہ قُربت اور ہمسائیگی باقی نہیں رہی۔ شہروں میں ایک ہی خاندان کے فرد اِتنے فاصلے پر رہتے ہیں کہ ایک ہی شہر میں رہ کر ایک دُوسرے کی صُورت دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔

حکیم حسّامُ الدّین اپنے وقت کے ناموَر طبیب تھے۔ رجواڑوں کے راجہ مہاراجہ اور ریاستوں کے نوّاب اُنھیں اپنے علاج مُعالجے کے لیے

بُلواتے، امرت سَر اور لاہور دو شہروں میں اُن کے مطب تھے۔ امرت سر میں جس محلّے میں وُہ مطب کرتے تھے۔ وُہ آج تک کٹڑہ حکیماں کے نام سے مشہور ہے

گُم شطرنج کھیلنے کے بہت ماہر تھے۔ بساط کو سامنے رکھّے بغیر محض یادداشت اور قوّتِ حافظہ کی بِناء پر شطرنج کھیلنے کا یہ فن اُس زمانے میں بڑی شہرت رکھتا تھا اور بہت کم شاطر اس فن میں کمال حاصل کر سکتے تھے۔ حکیم صاحب اِس کھیل میں بہت مشّاق تھے۔ بساط کی طرف پُشت کر کے بیٹھ جاتے اور اپنے مُہرے چلواتے رہتے۔

حکیم امینُ الدّین کو اپنے آبائی پیشۂ طبابت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اُنھوں نے اس طرف توجّہ ہی نہیں دی۔ مقامی طَور پر تعلیم مکمّل کر کے بیرسٹری کی تعلیم کے لیے ولایت چلے گئے اور وہاں سے کامیابی کے ساتھ واپس آ کر لائل پور

میں بیرسٹری شرُوع کر دی۔ اُس زمانے میں بیرسٹری بہت بڑا اعزاز تھا ہندوستان میں بیرسٹروں کی تعداد اتنی کم تھی کہ اُنگلیوں پر گِنی جا سکتی تھی۔ وکالت کے مشاغل سے وقت بچتا تو کتابوں کے مطالعے میں صَرف کرتے۔ بڑے شگفتہ بیان مُقرّر تھے۔ تقریر مُدلّل اور جان دار ہوتی۔

مال، دَولت، عِلم، عزّت، غرض اللہ تعالیٰ نے سبھی کچھ دے رکھا تھا، مگر اولادِ نرینہ سے محرُوم تھے۔ اُن کی رفیقۂ حیات حکیم احمد شجاع کی بہن تھیں۔ بیوی کی بہت دِلدہی کرتے اور اِس خیال سے کہ بیوی کی دل آزاری نہ ہو، اُنھوں نے دُوسری شادی نہیں کی۔

حکیم امین الدّین کی وکالت خُوب چمکی اور توقّع سے زیادہ چلی، مگر وُہ خود اپنی ذات پر بہُت کم خرچ کرتے، مُوکّلوں سے محنتانہ ملتے ہی اپنی بہنوں، اُن کے بچّوں اور دُوسرے مُستحق اور ضرورت مند عزیزوں کے نام منی آرڈر کے ذریعے رُوپیہ بھیج دیتے۔ روپے کا جوڑنا اور اُسے سینت سینت کر رکھنا وُہ جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے ذاتی مصارف اِس قدر مختصر کر رکھّے تھے کہ تھوڑی سی رقم میں کام چل جاتا۔ وہ بڑے با اصُول اور وضع دار اِنسان تھے۔ ایک بار جو اصُول مُقرّر کر لیا، اُسی پر سختی سے کاربند رہتے۔

لاہور میں سال کے سال شالامار باغ میں میلہ چراغاں بڑی دُھوم دھام کے ساتھ ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کو اس میلے میں شریک ہونے کا بڑا شوق تھا۔ اُن دِنوں چاہے وُہ کہیں اور کتنی ہی دُور کیوں نہ ہوتے، میلہ دیکھنے کے لیے لاہور پُہنچ کر رہتے۔ میلے جاتے ہُوئے مُجھے بھی اپنے ساتھ لے لیتے۔ اِس دَور میں نہ سینما ہاؤس تھے اور نہ تفرِیحی کلب تھے۔ بس، یہی میلے ٹھیلے عوام و خواص کی تفرِیح اور دلچسپی کا مرکز تھے۔ مجُھے اچھّی طرح یاد ہے کہ میری دادی جو اُن کی حقیقی ہمشیرہ تھیں، اِس میلے کے موقع پر میرے لیے نئے کپڑے تیار کرتیں اور صُبح سویرے اُٹھ کر مجُھے پہناتیں۔ اِتنے میں حکیم صاحب مرحُوم تشریف لے آتے، اور میری دادی کو آواز دیتے ـــــ بے بے! ـــــ بس اُن کی آواز سُنتے ہی اُن کے پاس پہنچ جاتا۔ حکیم صاحب مجھے لے کر شالامار

باغ کی طرف روانہ ہو جاتے ۔ اُن کے حقیقی چچازاد بھائی حکیم احمد شجاع لاہور میں اُن دِنوں موجُود ہوتے تو اُنھیں بھی ضرُور ہمراہ لیتے ۔ ہم چار پانچ گھنٹے میلے میں رہتے ۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے اور شام ڈھلنے سے پہلے مکان واپس آجاتے ۔ کیا بے فکری اور سکُون کا زمانہ تھا! کیسے محبّت والے لوگ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس دَور کی تفریحات اور دِلچسپیاں اَخلاقی گراوٹ سے کوسوں دُور تھیں ۔

حکیم صاحِب کے اَفکار و کردار کا سب سے نُمایاں پہلُو عشقِ حُسینؑ ہے ۔ مُحرّم کی مجالس میں بڑی پابندی کے ساتھ تقرِیریں کرتے ۔ اُن کی تقرِیریں دِل نشینی اور تاثیر کے ساتھ علمی و عقلی دلائل اور تاریخی حقائق سے لبریز ہوتیں ۔ ایامِ عاشورہ میں عوام کو شربت پلانے کے لیے سبیل لگاتے جس مٹکے میں شربت بنتا ہوتا، اُسے کمھار سے، جس کا گھر ہمارے مکان سے دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر تھا، خاص ہدایتیں دے کر بنواتے ۔ جب وُہ بن جاتا تو کمُھار کے یہاں جاتے اور مٹکا سر پر رکھ کر گھر واپس آتے ۔ راستے میں بھرے ہُوئے بازار اور آباد کوُچوں سے گزُرنا پڑتا ۔ راہگیروں کی بھیڑ، آنے جانے والوں کا مجمع، مگر حکیم صاحِب سر پر مٹکا اُٹھائے ہُوئے چلے جا رہے ہیں اور ذرّہ برابر سُبکی اور کمتری محسُوس نہیں کرتے ۔ نوکر جو پیچھے پیچھے چلتا ہوتا، عرض کرتا کہ لائیے ! مٹکا مجھے دے دیجیے ۔ اس کو جواب دیتے کہ بھیّا ! اِس مٹکے کو حضرت حُسینؑ کے نام پر پلائے جانے والے شربت

سے نسبت حاصل ہے۔ اس لیے اس فرض کو مَیں ہی انجام دُوں گا۔ یہ سعادت مَیں دُوسرے کو نہیں سونپ سکتا۔ ایک بیرسٹر اور بزرگانِ دین کی تکریم و عقیدت کے معاملے میں یہ نیاز مندی اور فروتنی! اس قدر خلوص و انکسار؛ ان مناظر کے لیے تو اب آنکھیں ترستی ہی رہتی ہیں۔

حکیم امین الدّین مرحوم کا مکان ایک بیرسٹر کی قیام گاہ ہی نہیں، بلکہ علم و ادب کی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔ علمی موضوعات اور فنونِ لطیفہ پر مذاکرے ہوتے۔ باقاعدگی کے ساتھ یہ محفلیں جمتیں۔ ڈاکٹر محمدؐ اقبالؒ، مولوی احمدؐ دین، محمدؐ شاہ وکیل، فقیر سیّد افتخار الدّین اور شیخ گلاب دین وغیرہ جیسے بزرگ ان محفلوں میں شریک ہوتے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی بعض مشہور نظمیں پہلے پہل یہیں سنائیں۔ اس محفل کے بعض دُوسرے شُرکاء نے بھی بڑے معرکے کی کتابیں لکھّیں۔ حکیم امین الدّین کی سیرت و کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے با اصول انسان تھے۔ زمانے کے سرد و گرم حالات اور زندگی کے تلخ و شیریں واقعات اُن کے معمولات پر اثر انداز ہونے نہ پاتے۔ جو وَضع قائم ہو گئی، اُسے نباہتے اور اپنے اصُول سے کسی حالت میں بھی نہ ہٹتے!

اُس زمانے کے بزُرگوں کا ذکر چل نکلا ہے تو اُس تمدّن اور مُعاشرت کی نُمایاں خُوبیاں بھی یاد آ رہی ہیں۔ نہ ہوٹل تھے، نہ کلب۔ شُرفاء کا دستُور تھا کہ کسی شہر میں مُسافر بن کر جاتے تو احباب اور رِشتے داروں کے ہاں مہمان بنتے۔ میزبان تواضع سے کام لیتے اور ذرا نہ گھبراتے بلکہ خوشی محسُوس

کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میاں نصیر الدین مرحوم، جن کے پوتے، جی۔معین الدین، اِس وقت الیکشن کمشنر ہیں، اپنی کوٹھی میں مہمانوں کے مستقل قیام و آرام کا بڑا اہتمام رکھتے۔ اس کوٹھی کا نام جی۔معین الدین صاحب کے والد میاں ریاض الدین کے نام پر "الرّیاض" تھا اور بریڈلاہال کے قریب واقع تھی۔ پنجاب بھر کے رؤسا اور شُرفا یہاں آکر ٹھہرتے۔ بعض دُوسرے بزرگوں کے مہمان خانے بھی خاصے مشہور تھے۔ اُس زمانے میں رؤسا کا یہ بھی دستور تھا کہ سفر کے لیے تنہا نہ نکلتے بلکہ درجنوں ملازم اُن کے ہمرکاب ہوتے، اور اِس بے تکلفی سے قیام کرتے جیسے بالکل اپنا گھر ہے۔

"الرّیاض" کا نام اُن دنوں اس طرح مشہور تھا، جیسے آج کل لاہور میں فلیٹی یا کراچی میں اِنٹرکانٹی نینٹل۔ قیام وطعام کی یہ سہولتیں شہر کے دُوسرے رؤسا کے ہاں بھی حسبِ استطاعت موجود تھیں۔ بلکہ بعض لوگ استطاعت سے بڑھ کر مہمان نوازی کا ثبوت دیتے۔

۱۹۱۳ئ یا ۱۹۱۴ئ کا واقعہ ہے۔ میرے والد سیالکوٹ میں تعینات تھے اور سرکاری فرائض کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ آغا صفدر کا گھر اُس زمانے میں شہر کا مشہور مہمان خانہ تھا۔ آغا صفدر سیالکوٹ کے رئیس اور دردمند مسلمان تھے۔ ہر کسی کی مدد اور دستگیری کے لیے تیار رہتے۔ قومی فلاح و بہبود کے کاموں میں سرگرم حصّہ لیتے۔ راقم الحروف کو کئی دفعہ اُن کا مہمان رہنے کا موقع ملا۔ ایک دفعہ آغا صفدر نے سیالکوٹ میں مسلمانوں کا ایک جلسۂ عام منعقد کرنے کا انتظام کیا۔ حکیم امین الدّین مرحوم جو ایک لائق قانون داں ہونے

کے علاوہ عُمدہ مُقرّر بھی تھے۔ اُنھیں اِس جلسے میں تقریر کے لیے مدعو کیا گیا۔ والد صاحِب اپنے ماموں حکیم امینُ الدّین کو لینے اسٹیشن پُہنچے۔ مَیں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ والد صاحِب حکیم صاحِب کو اپنے گھر لے آئے۔ اُدھر آغا صفدر کو جب یہ علم ہُوا کہ فقیر نجمُ الدّین حکیم امینُ الدّین کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے ہیں تو باوجُود اُن دیرینہ تعلّقات کے جو والد صاحِب اور اُن کے درمیان قائم تھے اور آغا صفدر جب کبھی لاہور آتے، ہمارے مکان واقع فقیر خانہ ہیں ہی قیام کرتے، بہت ناراض ہُوئے۔ کئی روز ہمارے ہاں تشریف نہ لائے اور بڑے کبیدہ خاطر ہوکر مُشترک اَحباب سے شکوہ کیا کہ فقیر نجمُ الدّین سے میرا اتنا گہرا تعلّق ہے کہ مجُھے اُن سے ہرگز یہ توقّع نہ تھی کہ میرے مہمان کو مجُھ سے چھین کر لے جائیں گے۔ والِد صاحِب کو جب عِلم ہُوا تو اُنھوں نے عرض کیا کہ حکیم امینُ الدّین میرے حقیقی ماموں ہیں۔ اگر وُہ میرے پاس مُقیم ہُوئے ہیں تو اُس کی شکایت آغا صفدر کو نہ ہونی چاہیے۔ بہرحال کچُھ عرصے کے بعد دونوں مخلص دوستوں کے درمیان یہ رنجش دُور ہُوئی۔

اگرچہ یہ معمُولی سا واقعہ ہے، لیکن اُس زمانے کے بزرگوں کی وضعداری اور جذبۂ مہمان نوازی کی بڑی خوب صورت جھلک اِس میں موجُود ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ مہمان نوازی اور برادرانہ محبّت کا یہ جذبہ اِسلامی روایات کا بہت بڑا خاصّہ ہے کہ نہ صِرف مہمانوں کو اپنے گھر کے لیے خیر و برکت کا باعث سمجھا جائے بلکہ مہمان نوازی کے معاملے میں ایک

دُوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کی جائے۔

قدیم بزرگوں کا اس پر یقین تھا کہ مہمان اپنی روزی خود اپنے ساتھ لاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہمان نوازی عربی اور اِسلامی تمدّن کی مُقدّس یادگار ہے۔

علّامہ اقبالؒ

علّامہ مرحُوم کی زندگی اور واقعات و مشاہدات پر تو میں دو کتابیں (روزگارِ فقیر" جلد اوّل و دوم) مرتّب کر چکا ہُوں۔ اِس کتاب کی تدوین کرتے ہُوئے علّامہ مرحُوم کا ایک ارشاد یاد آیا، جس کا ذکر اِس لیے بھی ضرُوری سمجھا گیا کہ علّامہ کے بغیر زِندگی بھر کے مشاہدات اور یادداشتوں کا مجمُوعہ نامکمّل اور ادھُورا رہے گا۔

۱۹۳۵ء میں "بالِ جبریل" شائع ہُوئی تو اقبالؒ کے دُوسرے عقیدتمندوں کی طرح میں نے بھی اِس کتاب کو بڑے شوق و دِلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ سیّد امجد علی نے، جنھوں نے "بالِ جبریل" کا اُنھی دِنوں مُطالعہ کیا تھا، مُجھ سے کہا کہ چلو! علّامہ سے چل کر ملیں اور "بالِ جبریل" کے متعلّق کُچھ باتیں کریں۔ میں تو علّامہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا۔ میں نے فوراً اُن کے یہاں چلنے کی ہامی بھر لی۔ چنانچہ ہم دونوں علّامہ کی قیام گاہ واقع میکلوڈ روڈ

کی طرف روانہ ہوئے ۔ راستے میں "بالِ جبریل" کی بعض نظموں اور غزلوں پر بحث ہوتی رہی ۔ امجد علی نے اس شعر کو بار بار اس انداز میں پڑھا جیسے وہ اِس میں کھٹک محسوس کر رہے ہیں ـــــ

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

جب ہم علّامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُنھوں نے بڑی خندہ پیشانی اور محبّت سے اپنے قریب بٹھایا ۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد امجد علی نے جُرأت کر کے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی ۔ بولے ـــــ

"ڈاکٹر صاحب ! 'بالِ جبریل' کے مُطالعے سے بعض مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر اللہ تعالیٰ سے نوک جھونک کے مُوڈ میں ہے ۔"

علّامہ نے 'جن پر پہلے سے تفکّر کا عالَم طاری تھا' چونک کر جواب میں فرمایا ـــــ

"بھائی ! تمھارا خیال درُست ہے، لیکن ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ خُدا سب کا ہے اور رسُولؐ ہمارا ہے اس لیے جہاں ناموسِ رسالتؐ یا رسُول اللہؐ کی ذاتِ اقدس کا تعلّق ہو، وہاں ایسی جرأت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔"

علّامہ کے اِن الفاظ سے کوئی اِس دھوکے میں نہ پڑ جائے کہ وہ

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس، لندن، کے موقع پر ایک دعوت کا منظر

علامہ اقبالؒ درمیانی میز پر ملک عمر حیات خاں کے بائیں طرف اور اُن کے مقابل قائداعظم محمد علی جناح تشریف فرما ہیں۔
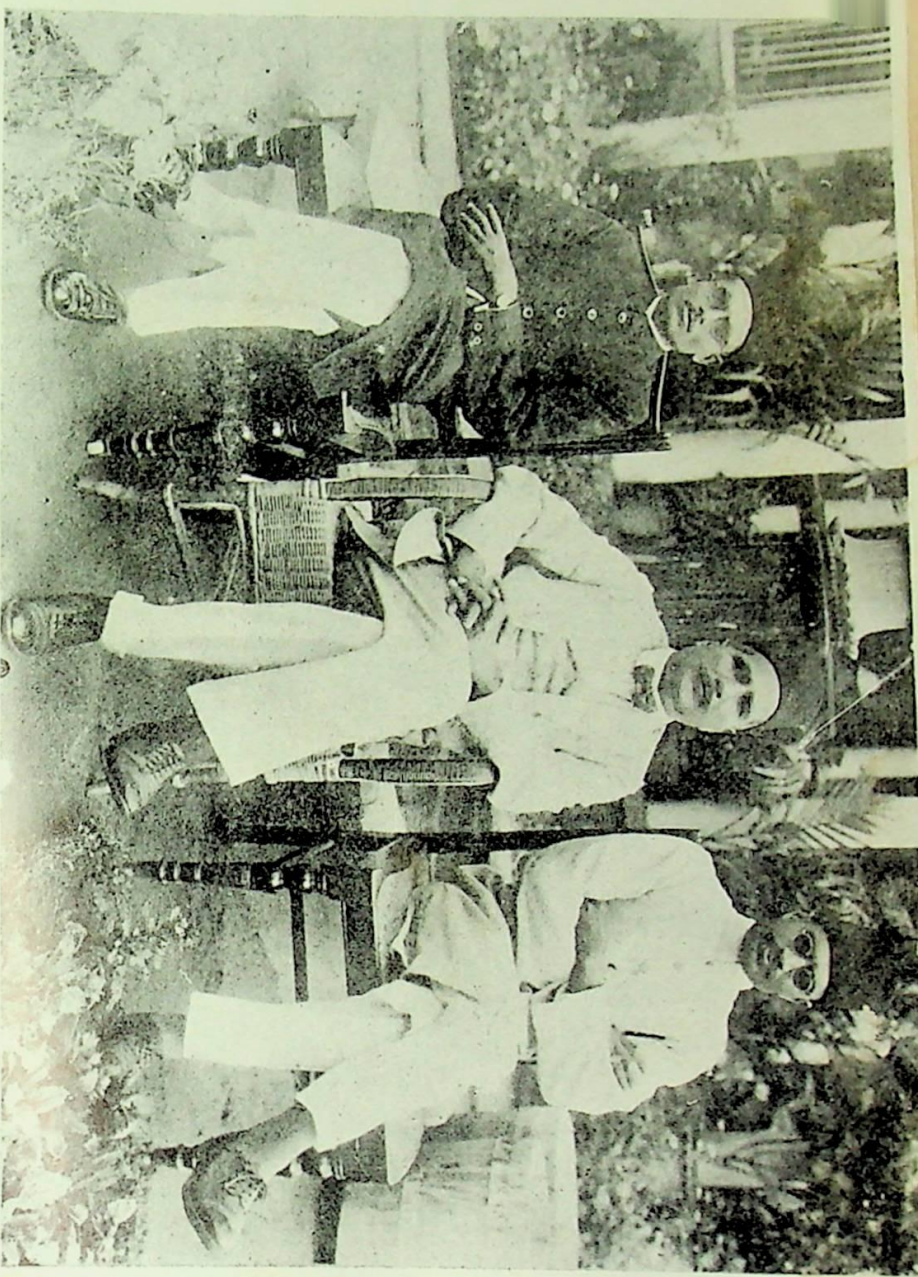
علامہ اقبالؒ کے دورۂ جنوبی ہندوستان کے موقع پر بنگلور میں لی ہوئی ایک
یادگار تصویر۔ علامہ اقبالؒ درمیان میں تشریف فرما ہیں۔ دائیں طرف جناب جمیل الرحمٰن، بائیں طرف جناب عبدالرحیم۔

خدانخواستہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ادب کے تقاضوں میں رعایت برتتے تھے۔ ایسا نہیں تھا۔ اقبالؒ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ گرامی سے بے پناہ محبّت اللہ تعالیٰ ہی کی رضا حاصل کرنے کے لیے تھی۔ ہاں، اُن کی شاعری میں کہیں کہیں "نازِ عبدیت" کی جھلک ضرور آگئی ہے اور اُن کے بعض اشعار میں جہاں اپنے محبوب آقا اور معبودِ حقیقی کے لیے شکوے کے پہلو موجود ہیں، وہاں احترام و عقیدت اور ناز و نیاز کا حسین امتزاج بھی نمایاں ہے۔ غور کیا جائے تو بندے کا ابتلائے دنیا کی شکایت اپنے خالق سے کرنا عجز و انکسار ہی کی دلیل ہے۔ جہاں تک حُبِّ رسولؐ اور ناموسِ رسالتؐ کا سوال ہے، اقبالؒ اس احترام و عقیدت کو اپنا سرمایۂ حیات اور زادِ آخرت سمجھتے تھے۔ خدا دلوں کا حال جانتا ہے کہ — عشقِ رسولؐ ہی کے سبب اس فقیر کو اقبالؒ کی ذات سے محبّت ہے۔

"روزگارِ فقیر"، جلد اوّل، جلد دوم اور "اقبال اِن پکچرز" میں علامہ اقبالؒ کی زندگی کے ہر دَور اور پہلو پر تصاویر جمع کر کے شائع کر چکا ہُوں، لیکن بزرگِ محترم حکیم احمد شجاع اور ڈاکٹر بشیر احمد ڈار ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی کراچی سے حال ہی میں چند اور تصاویر حاصل ہُوئی ہیں۔ یہ نادر تصاویر بھی محفوظ ہو جائیں، اس خیال سے اس باب میں انھیں شامل کیا جا رہا ہے۔

ایک قریبی صفحے پر جاپان کی یُونیورسٹی کی جانب سے دی ہُوئی ڈگری کا عکس شائع کیا جا رہا ہے، جو علامہ کو اُن کی اعلیٰ علمی خدمات کے

صلے میں ملی تھی۔

۴۴، ۴۵ سال قبل کی بات ہے۔ لاہور سے رسالہ "ہزار داستان" شائع ہوتا تھا۔ جناب حکیم احمد شجاع، سیّد عابد علی عابد اور ہادی حسین اُس کے مُدیر اور رئیس التحریر تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اس رسالے کے سرِورق کے لیے ایک شعر اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا، جو سال ہا سال "ہزار داستان" پر شائع ہوتا رہا۔ اس شعر کا عکس حاصل کر کے اس کتاب میں شائع کیا جا رہا ہے۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا

بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

اقبال

Diploma

Apr. 21, 1960

Sir Muhammad Iqbal

Born: Feb. 22, 1873

Died: Apr. 21, 1938

This is to certify that the above-mentioned has been awarded the degree of

EMERITUS DOCTOR OF LITERATURE

by Toyo University, Tokyo, Japan

Y. Oshima

Yutaka Oshima

President

File No. 3

第参号

称号記

サー・ムハマッド・イクバル

（一八七三―一九三八）

東洋大学名誉文学博士

の称号を授与する

昭和三十五年四月二十一日

東洋大学長　大嶋　豊

علامہ اقبالؒ کو سر کا خطاب ملنے پر لاہور کے شہریوں کی جانب سے دی گئی دعوت کا منظر۔ علامہ اقبالؒ درمیانی قطار میں تشریف فرما ہیں۔ اُن کے ہمراہ شیخ اصغر علی فنانشل کمشنر، سردار سُندر سنگھ مجیٹھیا، لالہ ہرکشن لال، میاں سر فضل حسین، ڈاکٹر سید علی نقی اور سید محمد عبداللہ۔
پچھلی قطار میں۔ سردار حبیب اللہ، چودھری فتح محمد، مسٹر جیٹری، لالہ گنپت رائے، نوابزادہ خورشید علی خان، رائے بہادر سوہن لال، نوابزادہ رشید علی خان، سید افضال علی حسنی۔ سید محمد شاہ۔ اگلی قطار میں فرش پر بیٹھے ہوئے۔ خواجہ فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء، حکیم احمد شجاع، سید بدھے شاہ

پٹھانوں کے متعلّق پیش گوئی

جناب فضل حق شیدا جو آج کل کراچی میں محکمۂ اطلاعات مغربی پاکستان کے ڈائرکٹر ہیں، ـــ صاحبِ ذوق اور خوش فکر انسان ہیں اور علامہ اقبالؒ کی ذات سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ ایک ملاقات میں موصوف علامہ کی شخصیت پر میری شائع کردہ تصانیف کا ذکر کر رہے تھے ـــ گفتگو کے دوران انھیں اپنی نوجوانی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ وہ خاص تاثر کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ واقعہ زندگی کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے، جس کی قدر و قیمت خود میرے دل میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ میرے اصرار پر انھوں نے پوری تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ سنایا، جسے میں قارئینِ "انجمن" تک پہنچا رہا ہوں۔

یہ مئی ۱۹۳۵ء، یعنی اب سے اکتیس (۳۱) برس پہلے کی بات ہے۔ علامہ اقبالؒ اُن دنوں میکلوڈ روڈ والے مکان میں رہتے تھے۔ صوبۂ سرحد

کے چار طلباء جن میں فضل حق شیدا کے علاوہ عبدالمجید خاں، عبدالواحد خاں
اور فیض اللہ خاں شامل تھے، علّامہ کی زیارت و ملاقات کا والہانہ
اشتیاق دلوں میں لیے ہُوئے صُبح سویرے اُن کی قیام گاہ پر پہنچے۔ یہ
چاروں اُس وقت لڑکے تھے، مگر اب عبدالمجید خاں محکمۂ تعلیم پشاور
کے ڈائرکٹر اور عبدالواحد خاں ریاست دِیر کے کالج کے پرنسپل ہیں ــــ
فیض اللہ خاں نے فوج میں ملازمت اختیار کی اور کرنل کے عُہدے
سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ شیدا صاحب کا آبائی وطن ضلع پشاور،
عبدُالمجید خاں کا ضلع ہزارہ، عبدُالواحد خاں کا ریاست دیر اور فیضُ اللہ خاں
ضلع کوہاٹ کے رہنے والے ہیں۔

سرحد کے یہ خوش باش اور صحت مند نوجوان اُن دنوں سنٹرل
ٹریننگ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان میں فضل حق شاعر تھے اور شیدا
تخلّص۔ پشتو میں اُنھوں نے علّامہ کی بعض نظموں کا ترجمہ بھی کیا تھا۔
یہ چاروں طلباء جب علّامہ کی قیام گاہ پر پہنچے تو سب سے پہلے علّامہ
کے دیرینہ وفادار خادم علی بخش سے ملاقات ہُوئی۔ انھوں نے کہا
کہ علّامہ کی خدمت میں جا کر کہو کہ فرنٹیر کے چار طالب علم اُن سے مِلنے
کے لیے حاضر ہُوئے ہیں۔ علی بخش اندر گیا اور ذراسی دیر میں واپس آ کر
بولا کہ آپ کو چند منٹ انتظار کرنا ہو گا۔ علّامہ آپ کو ابھی بلاتے ہیں۔
چُنانچہ یہ لوگ کمرے کے باہر بیٹھ گئے۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ گزرے

ہوں گے کہ علّامہ نے انھیں یاد فرمالیا ——— شیداؔ صاحب نے بیان کیا کہ ہمیں جس کمرے میں لے جایا گیا، اُسے دیکھ کر ہم بہت مُتاثّر ہُوئے۔ کمرے کا ساز و سامان عبرت کا ایک مُرقّع تھا۔ پھٹی پُرانی دری فرش پر بچھی ہُوئی۔ صوفہ سیٹ پُرانا اور شکستہ۔ کونے میں ایک پلنگ پر علّامہ نیم دراز تھے۔ بدن پر ململ کی قمیص اور تہمد۔ حُقّہ سامنے رکھا ہُوا مجھے حیرت ہُوئی کہ جس شخص کی شہرت اور ناموری کے دنیا میں جھنڈے گڑے ہُوئے ہیں، وہ کیسی قلندرانہ بلکہ فقیرانہ زندگی گزارتا ہے۔

ہمیں دیکھ کر علّامہ نے فرمایا ———

"تم پٹھان طالب علم ہو، میں تُم سے گلے ملنا چاہتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے بستر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔ ان طلباء نے علّامہ کی نقاہت کو دیکھتے ہُوئے دست بستہ استدعا کی کہ آپ براہِ کرم لیٹے رہیں۔ طلباء کے اصرار پر علّامہ تکیے کے سہارے پھر نیم دراز ہو گئے اور یہ لوگ قریب کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شیداؔ صاحب بیان کرتے ہیں کہ طویل علالت اور نقاہت کے باوجود علّامہ کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی۔ جسے ہم رونق اور اطمینان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کئی منٹ تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔ شیداؔ صاحب

کا بیان ہے کہ ہم چاروں دوست، نوجوان اور کم استعداد طالب علم، اِس عظیم انسان کے سامنے اپنے آپ کو بہت چھوٹا اور پست و بے مایہ محسوس کر رہے تھے۔ آغازِ گفتگو کی ہم جرأت ہی نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ علّامہ نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے خود ہی فرمایا ——

"مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کو دس پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ میں یونیورسٹی کے امتحان ایم اے فارسی کے پرچے دیکھ رہا تھا۔"

اس کے بعد علّامہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے اور بولے:

"پٹھانوں کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس قوم نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے اور مجھے توقع ہے کہ یہ آئندہ بھی اسلام کی عظمت و سربلندی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کریں گے۔"

انھوں نے فرمایا ——

"برخوردارو! دنیا کی متعدّد بڑی قومیں عروجِ کمال کو پہنچ کر زوال پذیر ہوئی ہیں اور آج کل تم جن ترقی یافتہ قوموں کو دیکھ رہے ہو، وہ بھی رُو بہ زوال ہیں —— لیکن —— پٹھان قوم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ابھی بچپن کی حالت

میں ہے یہ آہستہ آہستہ بڑھے گی، اور وہ زمانہ
عنقریب آنے والا ہے، جب یہ پُورے شباب
پر ہو گی۔ خدا کرے، میں اِس قوم کے عالمِ شباب
کو دیکھ سکوں ـــــ! میں جس آزاد اسلامی مملکت کا
تصوّر کر رہا ہُوں، مجھے اُمّید ہے کہ پٹھان اپنی
دیرینہ اسلامی روایات کے پیشِ نظر، اس کے قیام
میں بہت مدد دیں گے۔"

یہ چاروں دوست علّامہ کی گفتگو سے بہُت زیادہ مُتاثّر
ہُوئے اور اُن کی زبان سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ اُن کے دلوں
پر نقش ہوتا چلا گیا۔ پھر علّامہ نے اُن سے تعلیمی سرگرمیوں کے متعلّق
سوالات کیے۔ جن کا اُنھوں نے فرداً فرداً جواب دِیا۔ شیدؔا صاحب
چونکہ شاعر تھے، اس لیے اُن میں سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتے
تھے۔ اُنھوں نے شاعرانہ جرأت سے کام لیتے ہُوئے علّامہ کی خدمت
میں عرض کیا کہ "خاکسار نے ایک نظم آپ پر کہی ہے۔ اگر اجازت ہو تو
وہ نظم سناؤں۔"

علّامہ طلباء پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی گردن
کو جنبش دی، جو اجازت کا اِشارہ تھا ـــــ چنانچہ شیدا صاحب
نے نظم سنانی شروع کی، جس کے چند شعر اُنھیں اب تک یاد ہیں:

لیلائے وطن کا یہی شکوہ ہے زباں پر
گیسوئے پریشاں کے لیے شانہ نہیں ہے
ہے عہدِ نوی، پاس ترے ہے مئے کُہنہ
پُر بادۂ نَو سے ترا پیمانہ نہیں ہے!
بیکاروں کی محفل میں پیام اپنا سُنا مت
یہ درسِ عمل ہے، کوئی افسانہ نہیں ہے!
ظلمت کدۂ ہند میں اک شمع جلا کر
تُو نے غلطی کی، کوئی پروانہ نہیں ہے!

شیدؔا صاحب کہتے ہیں: وہ نوجوانی کی کم فہمی اور ناتجربہ کاری کا زمانہ تھا۔ اب میں سوچتا ہوں تو اپنی اِس جسارت پر ندامت محسُوس کرتا ہُوں کہ میں نے اقبالؒ جیسے شہرۂ آفاق شاعر اور عظیم فلسفی کے سامنے اپنے ان بچکانہ شعروں کے پڑھنے کی جرأت کس طرح کی ــــ! شیدؔا صاحب کہتے ہیں کہ میں شعر پڑھ رہا تھا اور علّامہ پر استغراق کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی گہرے سوچ میں کھو گئے۔ جب کئی منٹ تک یہی حالت رہی تو ہم چاروں دوست اُٹھے اور آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل آئے۔ علّامہ کو ہمارے اُٹھنے اور جانے کا علم ہی نہیں ہُوا۔

شیدؔا صاحب نے بتایا ــــ مغربی تہذیب سے بیزاری ور

انگریزوں سے نفرت کا جذبہ سب سے پہلے ہمارے دل و دماغ میں "کلامِ اقبالؒ" اور "پیامِ اقبالؒ" نے پیدا کیا۔ اور آج ہمیں اپنی قوم کا جو بلند کردار نظر آتا ہے اُس کی بہت کچھ تعمیر در اصل فکرِ اقبالؒ کی مرہونِ منّت ہے۔

اُن کا کہنا ہے کہ ۱۹۳۵ء کی اِس یادگار مُلاقات کے ٹھیک بارہ سال بعد جب سرحد کے ساٹھ لاکھ غیور پٹھانوں نے سخت مخالفتوں کے باوجود رِیفرینڈم میں تحریکِ پاکستان کا واضح طور پر ساتھ دیا اور ہماری یہ نئی خود مُختار مملکت (پاکستان) معرضِ وجُود میں آگئی تو میرا خیال مئی ۱۹۳۵ء کی اُس خوشگوار صُبح اور میکلوڈ روڈ والی علّامہ کی قیام گاہ کی طرف چلا گیا، جہاں علّامہ اقبالؒ نے ایک نئی آزاد مُسلم مملکت کے وجود اور اُس کے قیام میں پٹھانوں کے کردار کے متعلّق پیش گوئی کی تھی۔ میں نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ اُس مردِ درویش کی پیش گوئی صحیح ثابت ہُوئی اور پٹھان اُن توقّعات پر پورے اُترے، جو اقبال علیہ الرّحمتہ نے سالہا سال قبل اُن سے وابستہ کی تھیں!

حکیم فقیر محمّد چشتی

حکیم فقیر محمّد چشتی کی شخصیت رنگا رنگ صفات کا مجموعہ اور گوناگوں دلچسپیوں کا مُرقّع تھی۔

شروع شروع میں وہ سُوتر منڈی لاہور میں مطب کرتے تھے۔ بعد میں بارُود خانے کے قریب اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا اور اِس نو تعمیر مکان کا نام "شفا منزل" رکھا۔ اُن کے پیشے کی مُناسبت سے نام موزوں تھا۔ شفاء تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اَطبّاء اپنے امکان بھر اس کی کوشش کرتے ہیں کہ مریض شفایاب ہو جائیں۔ میں نے پہلی بار جب حکیم صاحب کو دیکھا ہے تو میری عُمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ہمارے خاندان میں طبیب کی حیثیت سے اُن کی آمد و رفت رہی۔ آگے چل کر یہ تعلّقات صرف علاج مُعالجے اور خاندانی طبیب کی حد تک نہ رہے۔ والدِ مرحوم اور حکیم صاحب کے مابین دوستانہ تعلّقات بھی استوار ہو گئے۔ جن موضوعات

اور فنونِ لطیفہ سے والد صاحب کو دلچسپی تھی، حُسنِ اتّفاق سے وُہی حکیم صاحب کے محبُوب و پسندیدہ مشاغل تھے۔ دوستی کے لیے پہلی شرط ذوق اور مزاج کا اِتّحاد ہے۔

طبِّ یُونانی کو مقبُول بنانے میں وُہ ہمیشہ سرگرم اور کوشاں رہے۔ اپنے پیشے میں اُنھوں نے بڑا نام پایا۔ خُوش نویسی کا بے اِنتہا شوق تھا۔ عام طور پر طبیبوں کے لکھے ہُوئے نُسخے خطِ شکستہ میں ہوتے ہیں۔ ایک طبیب کا یہ لطیفہ بھی سُننے میں آیا ہے کہ نُسخے میں "دانہ الائچی" کو اِس انداز سے تحریر کیا مریض کے گھر والوں نے اُسے "وَ اِنَّہٗ لَا یُحییٖ" پڑھ لیا، یعنی یہ کہ مریض زندہ نہ بچے گا۔ مگر حکیم فقیر محمّد چشتی کا لکھا ہُوا نُسخہ فنِّ خُوش نویسی کے اعتبار سے دِیدہ زیب ہوتا۔ اُن کا معمُول تھا کہ روزانہ ایک آدھ وصلی ضرُور لکھ لیتے۔ اِس طرح کتابت کی مشق جاری رہتی۔ مصوّری کا بھی ذوق رکھتے تھے جب فُرصت مِلتی، تصویریں بناتے تھے۔ خاص طَور سے موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔ والدِ مرحُوم کو طاؤس اور سُرود بجانے کا جو شوق تھا، اُس کا ذِکر "رُوزگارِ فقیر" میں کر چُکا ہُوں۔ اِسی ہم مشربی اور ہم مذاقی نے دوستی کی طرح ڈال دی۔

حکیم صاحب بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ محفلوں میں اُن کی حاضر جوابی کی پھلجھڑیاں خُوب بہار دکھاتیں اور اُن کے چُست فقروں سے ان مجلسوں کا لُطف دوبالا ہو جاتا۔ مجلسی علم بھی ایک فن ہے۔ یہ ہر کسی کو نہیں

آتا اور جس کو آجائے، لوگ اُسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اُن کے بہت سے فِقرے اور برجستہ جوابات ابھی تک ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن وہ سب کے سب حرف بہ حرف بیان نہیں کیے جاسکتے، کیونکہ بعض فِقروں میں شوخی اور بے تکلّفی کا رنگ خاصا گہرا ہوگیا ہے، اِس لیے میں بہ مصداقِ مُشتے از خروارے صرف ایک واقعے کا ذکر کرتا ہُوں۔

ایک دفعہ حکیم صاحب مرحُوم چودھری سر شہابُ الدّین کے عِلاج کے لیے اُن کی کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ چودھری صاحب سیاہ فام تھے، جس کا ذکر کتابوں اور مضمونوں میں بھی آچکا ہے۔ نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے نُسخہ لکھنے کے لیے جیب سے قلم نکالا اور ابھی چند لفظ ہی لکھے تھے کہ قلم کی سیاہی ختم ہوگئی۔ اِس پر چودھری شہابُ الدّین نے مزاحیہ انداز میں کہا ——

”حکیم صاحب! اگر سیاہی ختم ہوگئی ہے تو مُجھ سے لے لیجیے“۔

حکیم صاحب نے برجستہ جواب دیا ——

”جی! لے تو لیتا، آپ کے نامۂ اعمال میں کمی ہوجائے گی“۔

سر سکندر حیات مرحُوم کو دردِ گُردہ کی شکایت رہتی تھی۔ اِس مرض سے وہ بہت پریشان تھے۔ ڈاکٹر ہمیشہ یہی مشورہ دیتے کہ آپریشن کرالیا جائے۔ پتّھری نکل جائے گی اور تکلیف جاتی رہے گی۔ حکیم صاحب کو معلوم ہُوا تو اُنھوں نے سر سکندر حیات کو آپریشن سے روکا اور خود علاج کیا۔ چند دِن کے علاج سے گُردے کی کنکریاں ریزہ ریزہ ہوکر نکل گئیں اور سر سکندر

شفایاب ہو گئے ۔ سول سرجنوں اور ڈاکٹروں کو اس واقعے کا علم ہوا تو حیران رہ گئے ۔ کسی کسی کو تو یقین ہی نہ آیا۔ حکیم صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ نہ جانے اس قسم کے تیر بہدف مجرّب نسخے محفوظ کیے گئے ہیں یا نہیں ۔

حکیم صاحب کی شخصیت کا تعارف نامکمل رہے گا، بلکہ اُن کی ذات کے ساتھ ناانصافی ہوگی، اگر اردو شعر و ادب کی تاریخ پر اُن کے سب سے بڑے کارنامے کا ذکر نہ جائے ۔

یہی وہ حکیم فقیر محمّد چشتی ہیں، جنھوں نے حکیم الامّت، ڈاکٹر محمّد اقبالؒ کا سب سے پہلا فارسی مجموعۂ کلام ــــــ اسرارِ خودی ــــــ اپنے خرچ سے اپنی نگرانی میں شائع کیا تھا۔ علّامہ مرحوم کی یہ سب سے پہلی کتاب تھی، جس کی یورپ میں دھوم مچ گئی۔ اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا گیا اور علّامہ اپنے مُلک اور باہر کی دنیا میں فلسفۂ خودی کے خالق کی حیثیت سے مقبول اور متعارف ہوئے ۔ خدا کی شان دیکھیے کہ حکیم فقیر محمّد چشتی نے "اسرارِ خودی" کا جو سب سے پہلا ایڈیشن چھاپا تھا، اُس کی تعداد پانچ سو جلدوں سے زائد نہ تھی ۔ لیکن بعد میں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اب تک اُس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں، جن کے ذریعے ہزارہا جلدیں عقیدت مندانِ اقبالؒ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں اور یہ سلسلہ نہ صرف فارسی ایڈیشنوں کی صورت میں بدستور جاری ہے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے علمی ادارے مشہور زبانوں میں اس کے تراجم بھی کر رہے ہیں۔

اُس زمانے میں "سجع" کا رواج تھا۔ بعض بزرگ اپنے ناموں کا سجع خُود کہتے۔ ورنہ عام طور پر شعراء اور موزُوں طبع دوست احباب اِس خدمت کو انجام دیتے۔ سجع میں ممدُوح کا نام مصرعہ کے مفہوم اور لفظی دروبست میں بڑے سلیقے کے ساتھ سمو دیا جاتا۔ مثلاً ایک صاحب کا نام "محمدؐ احمدؐ" تھا۔ اُن کے نام کا سجع اِس طرح موزُوں کیا گیا۔

"انبیاءؑ جُملہ حمید اند محمدؐ احمدؐ"

حکیم فِقیر محمدؐ چشتی مرحُوم نے اپنے نام کا سجع خود کہا اور نہایت خُوش خط لکھ کر مطب میں آویزاں کر دِیا۔ جو کوئی مطب میں آتا، اِس سجع پر اُس کی نگاہ ضرُور پڑتی ـــــ

"شفاء از دو عالَم فقیرِ محمدؐ"

نوّاب ذوالفقار علی خاں

نوّاب ذوالفقار علی خاں مرحوم لاہور کے اُن مُمتاز افراد میں شمار کیے جاتے تھے، جن کا نام لیے بغیر مشاہیرِ پنجاب کی فہرست نامکمل اور ادھوری رہے گی۔ اُنھوں نے اپنے وطن اور قوم کو سربلند رکھنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ وہ سیاسی لیڈر نہ تھے، مگر قوم و وطن کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ بہت سی تنظیموں سے اُن کا گہرا تعلق رہا۔ متعدد انجمنیں اور ادارے اُنھوں نے خود قائم کیے، جن میں ایک Punjab Chiefs Association تھا۔ پنجاب کے قدیم اور مُمتاز خاندان اس ایسوسی ایشن کے ذریعے ایک سلکِ تنظیم میں مربُوط ہو گئے۔ عوام اور انگریزی حکومت کے درمیان خوشگوار روابط قائم کرنے کے لیے یہ انجمن خاصی مُفید ثابت ہوئی۔ ہندو، مُسلمان، سکھ، عیسائی تمام قوموں کے ممتاز نمائندے اِس ادارے کے رفیق اور معاون تھے۔ کسی فرقے یا خاندان کا کوئی مُطلب

یا مسئلہ ہوتا تو وہ اِس پنجاب چیفس ایسوسی ایشن کے توسّط سے پیش کیا جاتا۔ اور اکثر و بیشتر یہ توسّط کارگر ثابت ہوتا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ ادارہ کامیاب اِدارہ تھا۔

ذُوالفقار علی خاں مرحُوم "نوّاب" تھے، مگر دُوسرے نوّابوں کی طرح رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ اور امیرانہ شان و شوکت کی نمائش کے مشغلوں میں اپنے عزیز وقت کو ضائع کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ وُہ بہت سے تعلیمی اداروں اور انجمنوں کے سرپرست تھے۔ اِن سماجی کاموں کے سبب اُن کی زندگی بڑی مصرُوف رہتی۔ جو حاجت مند اُن کے پاس آتا، اِستطاعت کے مُطابق وُہ اُس کی دستگیری کرتے۔ خدمتِ خلق اُن کی زندگی کا روشن عنوان ہے۔ اِسی لیے عوام کے دِلوں میں اُن کے لیے بڑا اِحترام پایا جاتا تھا۔ کالجوں اور اسکُولوں کی تقریبات ہوتیں تو نوّاب صاحب سے اُن کی صدارت کے لیے اصرار کیا جاتا۔ اُن کی شخصیّت ایسی تھی کہ کُرسیِ صدارت اُن کو سچ مُچ زیب دیتی تھی۔

اُن کی عِلم دوستی اور جوہر شناسی کا صِرف ایک بات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعرِ مشرق، علاّمہ اقبالؒ اُن کے گہرے دوست تھے اور علاّمہ اقبالؒ کو اُن کی دوستی پر اِعتماد تھا۔ دوستی کے آغاز سے لے کر آخر عُمر تک علاّمہ اقبالؒ سے اُن کے دوستانہ تعلّقات بڑے خوشگوار رہے کسی قِسم کا کوئی کھچاؤ اور بدمزگی پیدا ہی نہیں ہونے پائی۔ دونوں دوستوں

کی باہمی رفاقت کا اندازہ سوانحِ اقبالؒ اور کلامِ اقبالؒ سے ہوتا ہے۔ نوّاب صاحب مرحوم کو علّامہ اقبالؒ سے جو خلوص اور عقیدت و محبّت تھی، اُس کا اظہار اِس واقعے سے ہوتا ہے کہ اقبالؒ کو ایک شاعر اور فلسفی کی حیثیت سے یورپ میں متعارف اور شناسا کرانے کے لیے اُنھوں نے "Voice of the East" کے نام سے ایک کتاب خود لکھی، پھر اپنے مصارف سے اُسے چھپوایا، اور یہ کوشش یہیں ختم نہیں ہوگئی، اس کتاب کو یورپ کے علمی حلقوں میں اُنھوں نے پھیلایا بھی۔ اِس کتاب نے مغرب کے دانشوروں کو چونکا دیا۔ بلکہ یُوں کہیے کہ اُن کے یہاں ہلچل سی پیدا کر دی۔ اِس کتاب کے دِیباچے میں نوّاب صاحب نے اپنے عزیز دوست اقبالؒ کے تعارُف کے سلسلے میں لِکھا ——

If the Peacock throne is the pride of Persia and the lustrous Koh - I - noor the glory of the British Crown, Iqbal would surely adorn the Court of the Muses in any Country.

"اگر تختِ طاؤس اہلِ ایران کے لیے مایۂ ناز ہے اور کوہِ نُور تاجِ برطانیہ کے لیے وجہِ افتخار ہے تو اِقبالؔ بھی کسی مُلک کے دربارِ کمال کی زیبائش میں ایسے ہی منصب کے مستحق ہیں۔"

شاعرِ مشرق کے بارے میں اُن کا یہ تاثّر ایک طرف اُن کے دلی خلوص و محبّت کا آئینہ دار ہے، دُوسری طرف اس سے اُن کی دیدہ وری اور جوہر شناسی کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے اقبالؒ کے مستقبل کی تابناکیاں بہت پہلے دیکھ لی تھیں اور شروع ہی میں اس کا اندازہ کر لیا تھا کہ یہ وہ شخصیت ہے جس پر آنے والی نسلیں فخر کریں گی اور کہیں گی ——

کہ عالم را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں دونوں کا ایک دُوسرے کے ہاں آنا جانا رہتا۔ ان صحبتوں میں ادب و سیاست اور شعر و فلسفہ کے مسائل پر گفتگو اور مذاکرے ہوتے۔ لطائف اور ظرائف بیان کیے جاتے۔ احباب کے قہقہے گُونجتے۔

نواب صاحب کا دل اور دسترخوان دونوں وسیع تھے۔ ضیافت اور مہمان نوازی سے انھیں دلی مسرّت حاصل ہوتی تھی۔

دوستوں اور شناساؤں کی دل دہی کا انھیں بہت خیال رہتا۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ والدِ مرحُوم کو ایک مقدّمے میں کامیابی ہُوئی تو نواب صاحب ہمارے گھر تشریف لائے۔ والد صاحب سے مل کر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور دیر تک بیٹھے رہے۔

نوّاب ذوالفقار علی خاں کے انتقال نے لاہور کے شہریوں میں حُزن و ملال کی سرد لہر دوڑا دی۔ خلقِ خدا کی خدمت نے عوام میں

اُن کی شخصیت کو جس قدر مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا تھا، اس کا صحیح اندازہ ان کے مرنے کے بعد ہُوا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ (آمین)

نواب صاحب کی زندگی کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ جب خداوندتعالیٰ کسی شخصیت میں دولت اور ذوقِ علم، عزّتِ نفس اور انسانی شرافت ایک ساتھ جمع کر دیتا ہے تو وہ ایک شخص نہیں رہتا اپنے دور کی انجمن بن جاتا ہے۔ نواب ذوالفقار علی خاں بھی اپنے دور کی ایک ایسی ہی جیتی جاگتی شخصیت تھے، بلکہ وہ انجمن بھی تھے اور رونقِ انجمن بھی ——!

———— ○ ————

حکیم سیّد عالم شاہ

حکیم صاحب سادات کے ایک معزّز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ راقم الحرُوف کی اُن سے دُور کی رِشتے داری تھی۔ اپنے وقت کے نامور طبیب اور خوش حال و باحیثیت شخص تھے۔ غریبوں کا علاج مُفت کرتے۔ مریض کے معائنے اور نبض دیکھنے کی فیس کا تو اُن دنوں کوئی رواج اور دستُور ہی نہ تھا۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب ڈاکٹری عام نہ ہُوئی تھی اور لوگ ایلوپیتھی علاج پر طبِّ یُونانی کو ترجیح دیتے تھے۔ طبیبوں کی مہارت اور شہُرت کے آگے ڈاکٹروں اور سِوِل سرجنوں کی شخصیّتیں دبی دبی سی تھیں۔

حکیم سیّد عالم شاہ کا نُور گلی لاہور میں ذاتی مکان تھا۔ یہ مکان نوابوں کی ڈیوڑھی اور امیروں کی حویلی جیسا تھا۔ سامنے کے رُخ پر ایک بڑا ہال تھا۔ جس کے ایک گوشے میں حکیم صاحب کی نشست رہتی۔ صُبح ہر روز وقتِ مقرّرہ پر تشریف لاتے۔ حکیم صاحب کی بائیں جانب دو تین شاگرد بیٹھتے

جو حکیم صاحب کی ہدایت کے مُطابق نُسخے لکھتے جاتے ۔ مریضوں کا ہجُوم خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو، مطب کا اِنتظام کچھ ایسا تھا کہ کوئی مریض ناکام واپس نہ جاتا ۔ ہر مریض اپنی باری پر حکیم صاحب کے سامنے آتا ' اپنا حال بیان کرتا اور نُسخہ لیتا جاتا ۔ حکیم صاحب کے لباس کی طرح اُن کی باتیں بھی بڑی سادہ ہوتی تھیں ۔ کسی قسم کا کوئی تکلّف نہیں ۔ اِس سادگی کے ساتھ خوش طبع اور شیریں گفتار تھے ۔ مریض سے نہایت خندہ پیشانی سے گفتگو کرتے ۔ پُوری توجّہ کے ساتھ اُس کا حال سُنتے ۔ مریض کے رُخصت ہونے تک اِس قدر دلچسپ اور تسلّی آمیز باتوں کا سلسلہ جاری رہتا کہ مریض کی بہُت کچھ تکلیف تو اُن کی گفتگو ہی سے جاتی رہتی ۔ یہ نفسِیاتی علاج ہی اپنی جگہ پیغامِ شفا ثابت ہوتا ۔ بعض مرِیضوں کی عادت ہے کہ وہ دوا کے اِستعمال اور پرہیز کے بارے میں عجیب عجیب سوال کرتے ہیں ۔ حکیم صاحب بڑے تحمّل سے کام لیتے اور غیر ضرُوری سوالات کا جواب دے کر مریض کو مطمئن کر دیتے ۔ جھُنجلانا، بگڑنا اور خفا ہونا تو جیسے اُن کو آتا ہی نہ تھا ۔ ہمارے وہ ایک طرح کے خاندانی معالج اور فیملی طبیب تھے ۔ اِس لیے مجھے اُن سے ملنے کا بار بار موقع مِلا ۔

ایک دفعہ میرے ایک عزیز بخار میں مبتلا ہو گئے اور حکیم صاحب کے علاج سے ان کا بخار اتر گیا ۔ وہ میرے ساتھ حکیم صاحب کے یہاں اپنا حال بیان کرنے کے لیے پہنچے ۔ حکیم صاحب نے پُوچھا :

اب کیا حال ہے ؟ اُنھوں نے جواب دیا، بُخار تو اُتر گیا ہے، مگر کمزوری بہت ہے۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا، کمزوری کس قسم کی ہے ؟ بولے ؛ زیادہ نہیں بولا جاتا۔ بہت کم بولتا ہوں ۔ اس پر حکیم صاحب نے فرمایا ــــــ

”بھائی ! کم بولنا تو نشانی ہے عقل مندی کی اور زیادہ بولنا نشانی ہے بے وقوفی کی ۔ آپ ان دونوں میں سے کس کو زیادہ پسند کرتے ہیں ؟“

حکیم صاحب کو کبوتر پالنے کا بے حد شوق تھا ۔ جب اُنھوں نے اپنے مکان کی تین منزلہ عمارت تعمیر کی تو اُس کی دیواروں کے بالائی حصّے میں کبوتروں کے لیے سوراخ بھی بنوائے ۔ بظاہر اُن سے کسی ہمسائے کی بے پردگی کا احتمال نہ تھا ۔ لیکن اُنھوں نے اسے کافی نہ سمجھا، بلکہ اہلِ محلّہ کو گھر میں بُلایا اور اُن سے کہا کہ وہ خُود دیکھ لیں اور اپنا پُورا اطمینان کرلیں کہ آیا ان سُوراخوں سے اُن کے مکانات کے اندرُونی حصّے تو نظر نہیں آتے ۔ اہلِ محلّہ نے اطمینان ظاہر کیا تو حکیم صاحب کی تسلّی ہُوئی ۔ اپنے ہمسایوں کے جذبات و احساسات کا اس طرح احترام کرنا وضعدار بزرگوں کی خاصیّت تھی اور یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اُس زمانے کی معاشرتی زندگی میں بڑی اہمیّت رکھتی تھیں ۔ دس منزلہ اور بیس منزلہ عمارتوں کے اس دَور میں ان باتوں پر غور کرنے کی کسے فُرصت ہے ۔

ایک بار سیّد امجد علی اپنے دوستوں کے ہمراہ شکار کھیلنے کے لیے

گئے۔ وہاں کوئی ایسی چیز کھالی کہ واپس آتے ہی صاحبِ فراش ہو گئے۔
کئی ڈاکٹروں کو دِکھایا، مگر تکلیف میں افاقہ نہیں ہوا۔ اصل مرض کیا ہے؟
یہ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ آخر گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ حکیم عالم شاہ صاحب
سے رُجوع کیا جائے اور مجھے اِس کام کے لیے مُنتخب کیا گیا کہ حکیم صاحب کو
اپنے ہمراہ لے کر آؤں۔ مَیں فوراً اُن کے مکان پر پہنچا۔ ابھی دروازے پر قدم
رکھا ہی تھا کہ ایک بورڈ نظر آیا، جس پر لکھا تھا "کوئی صاحب مطب سے
باہر لے جانے کے لیے اصرار کر کے مجھے شرمسار نہ فرمائیں"۔ میں نے بورڈ
کی اس عبارت کو غور سے پڑھا اور اندر چلا گیا۔ حکیم صاحب معمول کے
مُطابِق خُوش و خُرّم بیٹھے ہُوئے مریضوں کو دیکھ رہے تھے اور نسخے لکھواتے
جا رہے تھے۔ مُجھ سے دریافت کیا "کیسے آئے ہو؟" میں نے عرض کیا
"آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے حاضر ہُوا ہوں۔ امجد بیمار ہیں"۔ اس
پر مُسکرا کر بولے "بھئی! میں نے تو بورڈ نمایاں کر کے دروازے پر آویزاں
کرایا ہے۔ غالباً تُم نے اسے پڑھا نہیں۔ اپنی دُھن میں یُوں ہی گردن
نیچی کیے چلے آئے۔"

میں نے کہا "جی! میں نے آپ کا بورڈ پڑھا ہے، لیکن حکیم
صاحب قبلہ! گُستاخی معاف! آخر ایک دِن آپ کو بھی تو مرنا ہے۔
ہم جیسے عزیزوں اور دوستوں سے آپ نے بے اِعتنائی برتی تو پھر
آپ کے جنازے کو کاندھا کون دے گا؟" اس پر وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

مَیں نے محسُوس کیا کہ تیر صحیح نشانے پر بیٹھا۔ چنانچہ کہنے لگے، "اچھّا! میں چلتا ہُوں، لیکن جب تک میں ان مریضوں کو دیکھ لوں۔ تم سامنے والے مکان میں چلے جاؤ۔ وہاں میری رسمِ قُل ادا ہو رہی ہے۔ برادری کے سب لوگ جمع ہیں۔ تم بھی کھانا کھالو"۔ چُنانچہ حیرت و عبرت کے مِلے جُلے احساسات کے ساتھ میں وہاں پُہنچا، تو واقعی کھانا کِھلایا جا رہا تھا اور پُلاؤ زردہ وغیرہ وافر مقدار میں پکایا گیا تھا۔ حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق میں نے بھی کھانا کھایا اور واپس آیا۔ حکیم صاحب اس دوران میں میرے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

سفید کُرتا، لٹّھے کی چادر، سر پر سفید پگڑی، یہ اُن کا پسندیدہ لباس تھا۔ ہم لوگ جب کمرے سے باہر آئے تو حکیم صاحب نے سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر باورچیوں کو بُلایا۔ پہلے اُن سے دریافت کیا کہ کوئی شخص ایسا تو باقی نہیں ہے جس نے کھانا نہ کھایا ہو؟ جب اطمینان ہو گیا تو اُن سب کو اپنی جیب سے اُجرت ادا کی اور جہاں تک مجھے یاد ہے، اپنے گھر کے برتن جو اُس تقریب میں استعمال ہُوئے تھے، وُہ بھی اُنھیں کو دے دِیے۔

قُل خوانی اور ایصالِ ثواب کی رسم کو اُنھوں نے اپنی زندگی میں ہی ادا کیا۔ غالباً یہ کام وُہ اپنے مرنے کے بعد پسماندگان اور ورثاء کے لیے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے، میرے لیے یہ کافی حیرت کی بات تھی کہ ایک شخص اپنی زندگی ہی میں خود اپنے ہاتھوں اپنی ماتمی رسُوم ادا کر

رہا ہو۔

عزیزی امجد علی کی بیماری پیچیدہ ہوگئی تھی، مگر خدا نے فضل کیا، حکیم صاحب کے علاج سے وہ صحت یاب ہوگئے۔

چند ہفتوں کے بعد خبر ملی کہ حکیم صاحب علیل ہیں۔ میں مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوا۔ حکیم صاحب بستر پر لیٹے ہوئے تھے، پائنتی کی طرف میری نگاہ گئی تو وہاں شیشے کے ایک کیس میں سفید رنگ کا کپڑا تہ کیا ہوا رکھا تھا۔ حکیم صاحب کی نگاہیں بار بار اُس کپڑے پر پڑتی تھیں۔ میں نے دریافت کیا "حکیم صاحب! یہ کیا ہے؟"

جواب میں فرمایا——

"یہ میرا کفن ہے، جسے میں نے اپنی زندگی میں ہی درزی سے تیار کرا کے یہاں رکھوا لیا ہے تاکہ میری نظر اس پر پڑتی رہے۔"

اب سوچتا ہوں تو یہ نکتہ ذہن میں آتا ہے کہ موت کو زندگی میں بار بار یاد کرنا مردِ مومن کی خاص صفت بتائی گئی ہے۔ موت کی یاد کے ساتھ آخرت کا خوف اُبھرتا ہے اور دنیا کی مکروہات سے دِل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب مرحوم نے اِس صفت کو اپنانے کے لیے بڑا حوصلہ مندانہ طریقہ اختیار کیا ورنہ بڑے آدمی اور مال دار لوگ تو موت کے ذکر اور یاد سے دُور بھاگتے ہیں اور اِس نام سے اُنھیں پسینہ آجاتا ہے۔

میں نے ایک عزیز کو حکیم صاحب کا یہ واقعہ سُنایا تو اُنھوں نے کہا کہ بھائی! تمھیں تو بس اِتنی سی بات معلوم ہے۔ حکیم صاحب نے تو جیتے جی قبرستان میں جاکر اپنے ناپ کی قبر بھی تیار کرا لی تھی۔ جب وہ بن گئی تو اُس میں لیٹ کر دیکھا۔ پھر اُس کو گندم سے بھروا دیا اور وصیّت کی کہ مجھے دفن کرتے وقت یہ گندم خیرات کر دی جائے۔ گورکنوں کو اُجرت بھی خُود ادا کی۔ غرضیکہ ذرا سی ذمّہ داری بھی وُرثا اور پسماندگان کے لیے باقی نہ چھوڑی۔ ایسا محسُوس ہوتا ہے کہ اُنھیں جس طرح دُنیا کی بے ثباتی کا اندازہ تھا۔ شاید اِسی طرح عزیزوں کے تعلّقات کی بے ثباتی کا بھی گمان تھا۔

یہ واقعات بڑے عبرت انگیز ہیں۔ دلِ بیدار کے لیے اِن میں بہت کچھ ہے، مگر قلبِ غافل کے لیے تو یہ قصّے کہانیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اِس دُنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اُن کے لیے موت بڑی ڈراؤنی چیز ہے، وہ دُنیا کو کسی قیمت پر چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ اُن کی جان بڑی مشکل سے نِکلتی ہے، کیونکہ دُنیا کی ایک ایک چیز میں دل اٹکا ہوتا ہے، لیکن جو لوگ اِس زندگی کے بعد دُوسری زندگی کے بھی قائل ہیں، اُن مردانِ باخُدا کی نِگاہ میں تو موت ایک پُل کی مانند ہے جو دوست کو دوست سے مِلا دیتا ہے

(الموت جسرٌ یوصل الحبیب الی الحبیب)

مولٰینا ظفر علی خان

مولٰینا ظفر علی خان کی ذات گُونا گُوں صِفات کی جامع تھی۔ ایک طرف وہ بلند پایہ صحافی تھے، دوسری طرف نامور لیڈر رہتے، ساتھ ہی شعلہ بیان مقرر بھی۔ شاعری میں زُود گوئی اور برجستہ نگاری کی مشق کمالِ اعجاز کو پہنچی ہُوئی، خاص طور سے طنز میں تو اپنا آپ جواب تھے۔ انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے میں ان کا کوئی حریف اور مدِمقابل نہ تھا۔ مولٰینا شبلی نُعمانی کی کتاب "اَلفارُوق" کا انگریزی ترجمہ Omer the Great اور ڈریپر کی کتاب Conflict between Religions and Science کا اردو ترجمہ معرکۂ مذہب وسائنس اس کے جواب میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ہمارے گھر سے تھوڑے فاصلے پر منٹو پارک میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اُس مشہور تاریخی اجلاس کے انتظامات ہو رہے تھے، جس نے ۱۹۴۰ سنہ میں "قراردادِ پاکستان" منظور کی تھی۔ میں اکثر اُدھر جاتا تو نواب شاہنواز خاں

محمد وٹ جو اِس عظیمُ الشّان جلسے کے مہتمِ اعلیٰ تھے اور اخراجات بھی خود ہی برداشت کر رہے تھے۔ کارکنوں کی کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود ہر کام ذاتی دلچسپی سے کرتے نظر آتے۔ کبھی ہاتھ میں فیتہ لیے ہُوئے پنڈال کی حدُود کی پیمائش کر رہے ہیں، کبھی نِشستوں کے متعلّق کارکنوں کو ہدایات دے رہے ہیں۔ اِس عظیمُ الشّان اجلاس کے شاہانہ اِنتظامات جب مکمّل ہو چکے تو قائدِ اعظمؒ کی سربراہی و صدارت میں اجلاس کا آغاز ہُوا۔ قائدِ اعظمؒ نے انگریزی زبان میں بڑے معرکے کا خطبۂ صدارت اِرشاد فرمایا، جس کے ترجمے کی خدمت مولٰینا ظفر علی خان کو تفوِیض ہُوئی۔ تقریر ختم ہوتے ہی مولٰینا مرحوم اُٹھے اور قائدِ اعظمؒ کی انگریزی تقریر کا ترجمہ اِس قدر شگُفتگی اور روانی کے ساتھ کیا کہ سامعین حیران رہ گئے۔ اِس کِبر سنی میں مولٰینا کا حافظہ قابلِ داد تھا کہ اِتنی طوِیل تقریر کو اُنھوں نے یاد رکھا اور پھر اپنی خداداد ذہانت کی بدولت اردو ترجمے کی کلیاں چٹکا دیں۔

ردِیف و قافیے کی تلاش اور اِنتخاب میں مولٰینا کی مُشکِل پسندی ضربُ المثل رہی ہے۔ ایسے ایسے دقیق و مُشکل قافیوں کو نظم کیا ہے کہ ایسے مقامات پر بڑے بڑے مشّاق شاعروں کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے، لیکن اِس موقع پر اُن کا اندازِ بیان خاصہ تند و تیز تھا۔ "اُکھاڑ دے پچھاڑ دے" کی ردِیف میں اشعار پڑھتے ہُوئے جب اِس شعر پر پُہنچے

تہذیبِ نَو کے منہ پر وہ تھپّڑ رسید کر ‏ ‏ ‏ جو اِس حرامزادی کا حُلیہ بگاڑ دے

تو سارا پنڈال کشتِ زعفران بن گیا اور انگریزی تعلیم یافتہ سنجیدہ طبقہ اور زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ مولٰینا ظفر علی خان زُود گوئی میں یدِطُولیٰ رکھتے تھے۔ قدرتِ کلام، مشّاقی، حاضر دماغی اور آمد کا یہ عالم کہ الفاظ اور مضامین تو اُن کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ سنگلاخ اور دُشوار زمینوں میں شعر کہتے، بلکہ یوں کہیے پھُول کھِلاتے۔ اُن کا خاص کمال یہ تھا کہ نامانُوس اور غریب الفاظ کو اس حُسن و خوبی کے ساتھ شاعری میں استعمال کرتے کہ شعر کی روانی اور سلاست میں اور اضافہ ہو جاتا۔

ایک دفعہ انگریزی حکُومت نے اُن کا پریس ضبط کیا اور خُود انھیں جیل میں ڈال دیا۔ اِس ظُلم و تشدّد نے مولٰینا کو اور زیادہ پُرجوش اور بے باک بنا دیا۔ دِین و ملّت کے لیے اُن کا دل نرم اور رقیق تھا، مگر حق گوئی کے معاملے میں اُن کا کردار فولاد کی طرح بے لچک ثابت ہوُا۔ اُنھوں نے جیل میں ایک نظم کہی، اور اُسے جیل سے باہر پہنچا بھی دیا۔ شاہی مسجد لاہور میں نمازِ جمعہ کے بعد ایک خُوش الحان نوجوان نے یہ نظم پڑھ کر سُنائی، جس کے بعض اشعار مجھے اب تک یاد ہیں۔

خود اپنے دل کے اندر اک جہاں موجود پاتا ہوں
اُسی کی سلطنت اچھّی، اُسی پر اختیار اچھّا!
مری روزی نہ کی قُرق اُس نے میری سرکشی پر بھی
خداوندانِ لندن سے مرا پروردگار اچھّا!

اگر دیں سے تمسخر کرنے والے ہی مہذّب ہیں
تو ان تہذیب کے پُتلوں سے مجھ جیسا گنوار اچھّا

انجبار "زمیندار" پر حکومت نے مقدمہ قائم کیا۔ اُس کی سماعت کے وقت میں بھی عدالت میں موجود تھا۔ مولٰینا نے جس شخص کے نام پر ڈیکلریشن حاصل کیا تھا، وہ بالکل اَن پڑھ تھا۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ جج نے سوال کیا ——

" ریکارڈ سے ظاہر ہے کہ انجبار "زمیندار" کا ڈیکلریشن جس شخص کے نام پر لیا گیا ہے، وہ بالکل اَن پڑھ ہے۔ آپ بتائیں کہ اَن پڑھ آدمی انجبار کی نگرانی کس طرح کر سکتا ہے"۔

مولٰینا ظفر علی خان نے جج کے اِس سوال کا برجستہ جواب دیا ——
"جس طرح رنجیت سنگھ پنجاب پر حکومت کرتا تھا"۔

اِس مثال سے مولٰینا کی برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ایک اور واقعہ سنیے :
مسجد شہید گنج کی تحریک کا زمانہ تھا، حکومت نے فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے سلسلے میں انجبارات پر یہ پابندی لگائی کہ وہ لیڈنگ آرٹیکل شائع کرنے سے قبل متعلقہ حُکام کو دکھائیں اور اُس کی باقاعدہ منظوری لیں۔ شیخ فضل الٰہی

ان دنوں محکمہ انفارمیشن کے ڈائرکٹر تھے، سنسر کے اِس اِنتظام کی نگرانی اُنھیں کے سپُرد تھی —— اخبار "زمیندار" کو بھی یہ ہدایت موصُول ہُوئی ۔ چونکہ مولٰینا ظفر علی خاں کے بے باک قلم سے حکومت کو سب سے زیادہ خوف تھا؛ ہدایت کے مطابق مولٰینا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کا لیڈر لِکھنے کے بعد شیخ فضل الٰہی کو بھجوایا —— اخبار ہر روز باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا ۔ اُدھر حکّام کی جانب سے لیڈر کی منظوری میں تاخیر ہُوئی ۔ مولٰینا کی خداداد ذہانت نے یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا —— اُنھوں نے اخبار شائع کرتے ہُوئے اداریے کا کالم بالکل خالی رکھّا، البتّہ اُس کے درمیان میں یہ شعر لکھ دیا ——

میرے اِس لیڈر پہ ہے فضلِ الٰہی کس قدر
شوشہ شوشہ، نُقطہ نُقطہ نذرِ سنسر ہوگیا

مولٰینا ظفر علی خان مرحُوم سے میری آخری ملاقات دہلی میں ہُوئی ۔ یہ ملاقات اچھّا خاصہ لطیفہ بن گئی ۔ میں جس محکمے میں کمانڈنگ افسر تھا، اس میں صُوبیدار میجر عبدُاللہ بھی کارگزار تھے ۔ فوج اور سِول میں سال کے سال حکُومت کی جانب سے سرکاری عُہدیداروں اور دُوسرے معزّز شہریوں کو خطابات دِیے جاتے تھے ۔ مَیں نے حُسنِ کارکردگی کی بناء پر اُن کے لِیے O. B. I. (او-بی-آئی)

کے خطاب کی سفارش کی، جسے حکومت نے منظور کر لیا۔ صوبیدار میجر عبداللہ نے اس اعزاز کی خوشی میں چائے کی دعوت کا اہتمام کیا اور مجھے اس تقریب کا مہمانِ خصوصی بنایا۔ اپنے ہی محکمے کے ایک جونیر افسر کی تقریب، پھر وضعداری اور اخلاق کا تقاضا، بس اس تقریب میں شرکت کے لیے پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولٰینا ظفر علی خان وہاں تشریف فرما ہیں۔ حیرت کے ساتھ مسرت بھی ہوئی۔ میرا اُن سے تعارف ہوا تو فرمایا

"بھئی! مَیں تمھارے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں"۔

ابھی مہمان چائے پینے ہی میں مصروف تھے کہ صوبیدار میجر عبداللہ اپنے خاص انداز میں کھڑے ہوئے اور تقریر شروع کر دی۔ یہ تقریر آغاز سے لے کر اختتام تک میری ہی تعریف میں تھی۔ میرے لیے بڑی مشکل آن پڑی۔ میں تقریر کرنے سے اُنھیں روک بھی نہیں سکتا تھا کہ خدا کے لیے نثر کے اس قصیدے کو زیادہ طول نہ دو۔ وہ تقریر کر چکے تو اصولی طور پر مجھے اس کا جواب دینا تھا، لیکن میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ مولٰینا ظفر علی خان جیسے شعلہ بیان مقرّر کی موجودگی میں میری لب کشائی کہیں مذاق بن کر نہ رہ جائے۔ پھر مجھے تقریر کی مہارت تھی نہ شوق۔ لیکن چار و ناچار مجھے صوبیدار میجر عبداللہ کی استقبالیہ تقریر کا جواب دینا پڑا۔ میں اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کھڑا ہوا اور کہنا شروع کیا:

"...... مولٰینا ظفر علی خان جیسے عظیم المرتبت مقرّر

کی موجودگی میں میری لب کشائی سراسر جسارت ہے، لیکن
صوبیدار میجر عبداللہ کے خیالات سے مجھے اتفاق نہیں ہے،
اس لیے میں اس جسارت پر مجبور ہوں۔ انھوں نے خاکسار
کے بارے میں تحسین و ستائش کے جو کلمات کہے ہیں اور
او۔ بی۔ آئی کے خطاب کا سہرا میرے سر باندھنے کی کوشش
کی ہے، وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ خطاب دراصل اُن
کی اپنی لیاقت، محنت و دیانت اور اعلیٰ خدمات کا صلہ ہے
جو حکومت نے اُنھیں عطا کیا۔ میرا تو اس معاملے سے بس اتنا
تعلق ہے کہ میں نے اُن کے نام کی سفارش کر کے اپنا
فرض ادا کیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے فرض کے ادا کرنے
میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا۔۔۔۔۔"

میں یہ چند جملے کہہ کر اپنی نشست پر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اتنے
میں مولینا نے فرمایا:

"اگر آپ کو صوبیدار میجر عبداللہ کی تقریر سے اتفاق
نہیں ہے تو مجھے آپ کے اس اظہارِ خیال سے اتفاق
نہیں ہے کہ آپ تقریر نہیں کر سکتے اور یہ کہ اپنے فرض کا
دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا کوئی قابلِ تعریف کام نہیں ہے۔"

اس تقریب کا یہ کس قدر دلچسپ اتفاق تھا کہ میں نے اپنے اظہارِ

خیال کا آغاز "اتفاق نہیں" سے کیا اور مولٰینا کے جواب کا عنوان بھی "اتفاق نہیں" تھا اور خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اس برجستہ تبصرے میں "اتفاق نہیں" کے موضوع پر کیسا دلچسپ نکتہ بیان کیا۔ مولٰینا مرحوم کے ان لفظوں میں جو شفقت اور بزرگانہ محبت پنہاں تھی، اُسی کا یہ اثر ہے کہ یہ واقعہ اور اُن کے یہ الفاظ مجھے اچھے شعروں کی طرح اب تک یاد ہیں۔

مَیں عرض کر چکا ہوں کہ مولٰینا ظفر علی خان کو اُردو اور انگریزی ترجمے کی غیر معمولی مہارت تھی۔ اس سلسلے میں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ والدِ مرحوم نے مسٹر امیر علی کی شہرۂ آفاق تصنیف The Spirit of Islam کا اپنے شوق سے اردو ترجمہ شروع کیا تھا۔ ترجمے کے دوران تحقیقی مراحل میں وہ مولٰینا ظفر علی خان سے مشورہ لیتے رہے۔ میں نے کئی بار اُنھیں یہ کہتے ہوئے سُنا کہ مولٰینا نے میرے ترجمے کو اچھا نہیں بہت اچھا فرمایا ہے۔ یہ ترجمہ والد مرحوم نے اپنی زندگی میں مکمل کر لیا تھا۔ اُنھوں نے اس کی تیاری میں بڑا وقت صرف کیا تھا اور وقت ہی نہیں خُونِ جگر بھی! مگر افسوس ہے کہ ہماری بے پروائی، غفلت اور ناسمجھی کے سبب یہ قیمتی نایاب مُسوّدہ ضائع ہو گیا۔

مولٰینا ظفر علی خان انگریزی اصطلاحات کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا بھی بڑا ملکہ اور سلیقہ رکھتے تھے۔ ۱۹۳۳ء میں جب سر سیموئیل ہور وزیرِ ہند تھے تو برطانوی حکومت نے White Paper کے نام سے ایک اہم دستاویز شائع کی تھی۔ یہ دستاویز ہندوستانیوں کے حقوق کا سیاسی منشور تھی۔ مولٰینا

ظفر علی خان نے اس کا ترجمہ "قرطاسِ ابیض" کیا اور یہ اِصطلاح اخباروں میں چھپتے ہی مقبول ہوگئی اور آج تک زبان زدِ خاص و عام ہے۔ غالباً "At Home" کا ترجمہ "عصرانہ" بھی مولٰینا کے ذہن رسا کا حسین شاہکار ہے۔ اِسی طرح اور بہت سی خوبصورت تراکیب اور اِصطلاحیں ہیں جنھوں نے اردو زبان کو وسعت دی ہے اور اُس کے حُسن میں اضافہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہ یک وقت اِتنی بہت سی خُوبیوں سے آراستہ شخصیّتیں روز روز نہیں، کبھی کبھار ہی پیدا ہوتی ہیں اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جب قُدرت کسی قوم یا نسل پر احسان کرنا چاہتی ہے تو ایسی ہستیاں اُسے "اِنعام" کے طور پر دی جاتی ہیں۔ علاّمہ اقبالؒ نے کتنی سچّی بات کہی ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دِیدہ وَر پیدا

مولٰینا ظفر علی خاں کا مشہُور اخبار "زمیندار" جسے وہ ہر قسم کی ابتلا اور آزمائش میں باقاعدگی سے شائع کرتے رہے، میں نے اس اخبار کا شباب دیکھا ہے۔ یہ وہ عالم تھا کہ کم از کم اردو صحافت میں نہ اُس کا کوئی مدِمقابل تھا نہ ہم پلّہ اور نہ اِس قدر مقبُول۔ مُلک کے طُول و عرض میں "زمیندار" کے معرکہ آرا اداریوں، بیباکانہ تبصروں اور قومی نظموں کی دُھوم تھی۔ شرُوع شرُوع میں اس اخبار کی پیشانی پر یہ شعر شائع ہوتا تھا:

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

بعد میں انگریزی حکومت کے مُسلسل استبداد اور اکثریتی فرقے کی پیدا کردہ ریشہ دوانیوں کے طوفان کا مقابلہ کرتے ہُوئے اُنھوں نے "زمیندار" کی پیشانی پر اپنا یہ شعر شائع کرنا شرُوع کر دیا تھا :

نُورِ خُدا ہے کُفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھُونکوں سے یہ چراغ بُجھایا نہ جائے گا

لیکن جن لوگوں نے "زمیندار" کا پہلا دَور اپنی نگاہوں سے دیکھا ہے وُہ نہ "زمیندار" کے اُس جوش و ولولے کو بھُول سکتے ہیں نہ "زمیندار" کی پیشانی کے اِس شعر کو۔ میں خود عرصے تک اِس شعر کو پڑھتا رہا لیکن اِس کا صحیح لُطف اُس وقت اُٹھا سکا جب شعر کے پس منظر کو قرآنی مفہوم کے عین مطابق دیکھنے اور محسُوس کرنے کا موقع مِلا۔

قرآنِ مجید کی آیۂ کریمہ یہ ہے :

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔

اور اِس کا مفہوم اُردُو میں یہ ہے :

"تحقیق اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا حالت کسی قوم کی ،
جب تک کہ تبدیل نہ کریں خود اپنے حالات کو"۔

اندازہ ہُوا کہ قوموں کے کمال و زوال کے اِس قرآنی اصُول کو شعر میں کِس خُوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

خُود مولٰینا ظفر علی خاں کا یہ شعر بھی :

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی کی دل کش تفسیر ہے۔ اصل آیۂ کریمہ درج ذیل ہے:

"یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝" (سُوْرَۃُ الصَّفّ)

اور اس کا مفہوم حسبِ ذیل ہے:

"چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونھوں (کی پھونک) سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا گو کافر برا مانیں۔"

اسی طرح مولٰینا ظفر علی خان کا ایک اور شعر ہے جسے میں اکثر گنگناتا رہتا تھا:

توکّل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
پھر انجام اُس کی تیزی کا مقدّر کے حوالے کر

اس شعر میں مولٰینا کس قدر قیمتی نکتہ بیان کر گئے ہیں۔ اس کا صحیح علم بھی قرآنِ کریم کی تفسیر کے مطالعے کے دوران ہوا، جس میں لفظِ "توکّل" کے معنی یہ بتائے گئے ہیں:

"خداوندِ تعالیٰ نے جس قدر اسباب پیدا کیے

ہیں، اُن کو پُوری طرح اِستعمال کرنے کا نام توکّل ہے، نہ کہ
اُنھیں ترک کرنا۔ (اُن کے ترک کرنے کا نام توکّل نہیں ہے)

گویا مولٰینا یہاں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اِنسان اپنے تمام وسائل کے استعمال اور کوششوں کو آبِ خنجر کی طرح تیز رکھّے، پُوری طرح سرگرمِ عمل رہے۔ کوئی کوشش اور دقیقہ اپنی طرف سے اُٹھا نہ رکھے اور پھر دیکھے، اُس کی کوششوں کے نتیجے میں اُسے تائیدِ خداوندی کس طرح کامران و سُرخرو کرتی ہے اور یہ ایسی اٹل حقیقت ہے کہ اِنسان کو اس کے مُتعلّق فِکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اُس کے لیے نتیجہ قُدرتِ خُداوندی کے سپُرد کر دینا ہی کافی ہے اسی کا نام توکُّل ہے۔ کچھ نہ کرنا اور خُدائی امداد کا اِنتظار کرتے رہنا نہ صبر و قناعت کا تقاضا ہے اور نہ توکُّل و اِستغنا کا منشا۔

اکثر سوچتا ہُوں کہ مضامینِ قرآن میں یہ بصیرت اور اللہ تعالیٰ کے اِرشادات پر یقینِ کامِل، عشقِ رسُولؐ اللہ کے بغیر ہر گز ممکن نہیں۔ مولٰینا ظفر علی خان نے ساری زندگی اِسلام اور مُسلمانوں کی جو خدمت کی ہے، وُہ سب بارگاہِ رسالتؐ کا فیض ہے۔ اُنھیں رسُولِ پاکؐ سے جو گہری محبّت اور عقیدت تھی، وُہ کِسی تشریح کی مُحتاج نہیں۔ وُہ ساری زندگی عشقِ رسُولؐ کے اس کیف و مستی میں سرشار رہے اور اُن کا یہ حُبّ رسُولؐ وقتاً فوقتاً

اُشعار میں بھی ڈھلتا رہا۔ مثال کے طور پر اُن کا یہ شعر اُن کے جاں نثارِ رسولؐ ہونے کا ایک ثبوت بھی ہے اور والہانہ عقیدت سے لبریز جذبات کی دلکش تصویر بھی :

نہ کٹ جاؤں میں جب تک خواجۂ یثرب کی چوکھٹ پر
خُدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا!

فقط دو حقائق پہ دنیا ہے قائم
بقائے خدا و دوامِ محمدؐ
مولانا ظفر علی خان

نوّاب بہادر یار جنگ بہادر

۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاسِ لاہور کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ یہی وہ یادگار موقع اور تاریخی اجتماع تھا، جہاں مجھے سب سے پہلے نواب بہادر یار جنگ بہادر کی تقریر سُننے کا اتّفاق ہُوا۔ میرے عزیز سیّد امجد علی جو آج کل اقوامِ مُتّحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے ہیں، نواب صاحب سے بے حد متاثّر تھے۔ اُنھوں نے متعدّد بار نواب صاحب کی تقریریں سُنی تھیں۔ عزیزی سیّد امجد علی بہادر یار جنگ کی تقریر و خطابت کا ذکر اس انداز میں کیا کرتے تھے، جیسے نواب صاحب نے اپنی تقریروں کا نشہ انھیں گھول کر پلا دیا ہے۔ اُن کے اِصرار اور شوق دلانے پر میں بھی جلسہ گاہ پہنچا۔ میرے دوست ملک محمد امین ایڈوکیٹ اپنی محبت سے میرے ساتھ ہو لیئے کئی معرکہ آرا تقریروں کے بعد سادہ مگر دیدہ زیب مشرقی لباس میں حیدرآبادی شیروانی، دوہرا پائجامہ اور ترکی ٹوپی پہنے ایک صاحب مائیک

کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ اِس سے پہلے جن مقرّرین نے تقریریں کی تھیں، اُن کا نشہ دِل و دماغ پر چھایا ہُوا تھا اور کسی کسی نے تو واقعی دماغوں کو مسحُور کر دِیا تھا۔ چُنانچہ میرے دوست ملک محمد امین نے میرے کان میں کہا؛ ایسی اچھی تقریروں کے بعد یہ مولوی آکر کھڑا ہُوا ہے، سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔ چلو، واپس چلیں۔ مَیں نے بڑے اعتماد کے ساتھ جواب دِیا؛ نہیں، بھئی! امجد علی نے اِن صاحب کی تقریر کی بہُت تعریف کی ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ضرُور سُنیں گے۔ پسند نہ آئی تو چلے جائیں گے۔ بہادر یار جنگ نے تقریر شرُوع کی تو لوگ تھکے تھکے سے تھے۔ کچھ جمائیاں لے رہے تھے، مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بہادُر یار جنگ کی تمہید نے ہی سامعین کو اپنی طرف متوجّہ کر لیا۔ نواب صاحب کا بلند و بالا قد، بھرا ہُوا بدن، کِھلتی ہُوئی سپید و سُرخ رنگت۔ اِس چہرے مُہرے پر ڈاڑھی کیا بہار دے رہی تھی۔ آواز شِیریں، مگر اُس میں جھنکار بھی تھی۔ اِس قدر جاذبِ نظر شخصیت کے ساتھ اُن کا زورِ خطابت، جوشِ تقریر، اندازِ کلام۔ سارا مجمع ہمہ تن گوش بلکہ بُت بنا ہُوا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک فصاحت و بلاغت کی شبنم برساتے رہے، مگر دل یہی چاہتا تھا کہ خُدا کرے، یہ سلسلہ ابھی اور جاری رہے، یہ "لَے" ٹُوٹنے نہ پائے! بعض وقت تو ایسا محسُوس ہونے لگتا تھا، جیسے اُن کے آتش کدۂ دل سے شعُلے نکل کر ہواؤں میں تحلیل ہُوئے جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے سچ مُچ سب کے دل اپنی مُٹھّی میں لے لیے تھے اور جدھر چاہتے تھے، گُھما

دیتے تھے۔

قیامِ لاہور کے دوران نوّاب بہادر یار جنگ کو کئی روز تقریریں کرنا پڑیں۔ مُتعدّد اِداروں میں اُن کو مدعو کیا گیا۔ کوپر روڈ پر گرلز کالج میں بھی ایک اِجتماع ہُوا۔ مَیں اور امجد علی جب وہاں پہنچے تو جلسے کا جُغرافیہ یہ تھا: کہ طالبات و خواتین ایک لان پر ڈائس کے پیچھے بیٹھی ہُوئی تھیں۔ اُن کے سامنے ایسا پردہ تھا کہ پسِ پردہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پردے کے اِس طرف نوّاب بہادر یار جنگ اور مرد مہمانوں کی نشستیں تھیں۔ مَردوں کی تعداد بُہت ہی مختصر تھی۔ گِنے چُنے چند لوگ تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مرد سامعین میں سر عبدُالقادر، خان قُربان علی خان، سیّد امجد علی کے علاوہ دو تین مہمان اور ہوں گے۔

بہادر یار جنگ نے تقریر شرُوع کی اور سب سے پہلے مرد و زن کے اِس جُدا جُدا اِنتظامِ نشست اور پردے کے اِس اہتمام کو مُسلمانوں کی قومی غیرت اور خواتین کی اخلاقی برتری کے لیے فالِ نیک قرار دِیا، اُنھوں نے فرمایا کہ میری دُعا ہے کہ اخلاق کی پستی اور اخلاق کی بلندی کے درمیان یہ پردہ اور مضبُوط ہو جائے۔ اِسے کسی قیمت پر بھی اُٹھنے نہ دیجیے۔ اُنھوں نے طالبات کو بڑی مُفید نصیحتیں بھی کِیں۔ فضُول خرچی سے اِجتناب کرنے کے متعلّق نصیحت کرتے ہُوئے کہا:

"لڑکیاں ضرُورت سے زیادہ لباس نہ پہنیں۔"

تو اس پر سر عبدُالقادر فوراً بول اُٹھے :

''حضرت ! ان کو یہ بھی نصیحت فرمائیے کہ ضرورت سے کم بھی نہ پہنیں''۔

سر عبدُالقادر مرحوم کا یہ جملہ سنتے ہی نواب بہادر یار جنگ بے ساختہ مسکرا دیے اور اِس جملے سے لُطف اندوز ہوتے ہُوئے فرمایا :

''سر عبدُالقادر جیسے دانشور دوست سے مجھے اِسی قسم کے ریمارک کی توقّع تھی''۔

یاد رہے کہ اُس زمانے میں خواتین کا یہ رُجحان تھا کہ ملبُوسات کا عرض و طُول میں وافر ہونا عورت کی جامہ زیبی اور خوب صُورتی میں اضافہ کرتا تھا۔ آج کل کی طرح حُسن و کشش کا دار و مدار لباس کی انتہائی اختصار پسندی میں نہ تھا۔

آج عُریانی فیشن میں داخل ہے۔ اُس وقت عیب سمجھی جاتی تھی۔

اب سوچتا ہُوں ——

سر عبدُالقادر آج زندہ ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ اُن کے دل میں ۲۵ سال پہلے جو خطرہ گزرا تھا، وُہ غلط نہ تھا۔
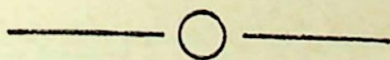
سیّد دلاور علی شاہؒ

نہایت پاک طینت بزرگ تھے۔ سادہ لباس، سادہ وضع قطع اور اسی طرح کی زندگی بھی۔ تکلّفات نے اُن کو چھُوا تک نہ تھا۔ اُنھیں بس ایک ہی شوق تھا، وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اُن سے علم حاصل کریں۔ عربی اور فارسی پڑھاتے تھے اور بعض لوگوں کے گھر جاکر پڑھاتے، مگر معاوضہ نہ لیتے۔ اس مُعاملے میں اُن کا نظریہ یہ تھا کہ علم فروخت کرنے کی چیز نہیں ہے۔ یہ ایسی دَولت ہے، جسے فراخ دلی سے تقسیم ہونا چاہیے۔ علم کا بخیل مال کے بخیل سے بڑا مُجرم ہے۔ مولوی محمّد حُسینؒ آزادؔ کے شاگرد تھے۔ صَوم وصلوٰۃ کے سختی کے ساتھ پابند۔ اس دینداری کے سبب اُن کی سب عزّت کرتے۔

میری چھوٹی بہن جہاں آراء مُنشی فاضل کا اِمتحان دینے کی تیّاری کررہی تھی۔ شاہ صاحب اُسے پڑھانے کے لیے ہر روز موچی دروازے

سے پیدل چل کر بازار حکیماں آتے اور دو ڈھائی گھنٹے پُوری توجہ کے ساتھ پڑھاتے۔ اُنھوں نے کئی مہینے تک یہ خدمت بغیر کسی مُعاوضے کے انجام دی۔ کوئی شخص مُعاوضے کا ذکر کرتا تو وُہ مُسکرا کر خاموش ہو جاتے، اُن کی مُسکراہٹ سوال کرنے والے کی نادانی اور علم کی صحیح قدر و قیمت سے بے خبری پر طنز ہوتی۔

میرا جوانی کا عالم تھا۔ لااُبالی طبیعت اور دِل و دماغ میں جذبات و خیالات کا مدّ و جزر، اور پھر انگریزی کتابیں پڑھنے اور افرنگی کے تہذیب و تمدّن سے متاثّر ہونے کے سبب آج کل کے نوجوانوں کی طرح صحیح منزل سے بے خبر، اِس کا پتہ ہی نہ تھا کہ زندگی کسے کہتے ہیں؟ اس کی واقعی قدریں کیا ہیں؟ آج کل کے مغرب زدہ نوجوانوں کی طرح میرا حال راستے کے اُس کنکر کی طرح تھا، ہر راہ رو کی ٹھوکر جس کا رُخ بدل دیتی ہے۔

ایک دِن میں نے شاہ صاحِب سے عرض کیا کہ مَیں قرآنِ کریم آپ سے پڑھنا چاہتا ہُوں۔ اُنھوں نے جواب میں کہا، "ہاں! بھئی، پڑھو اور ضرور پڑھو۔ بڑا مُبارک خیال ہے۔ جب کہو، مَیں آنا شروع کر دُوں گا۔ بات چیت میں مجھ بدبخت کے مُنہ سے جُملہ نکل گیا ——

"مَیں اِس لیے پڑھنا چاہتا ہُوں کہ دیکھوں، قرآن واقعی الہامی کتاب ہے؟"

میرے مُنہ سے اِس قسم کا بے تکا سوال سُن کر شاہ صاحِب سخت

خفا ہوئے۔ اُن کا چہرہ غُصّے کے مارے سُرخ ہو گیا۔ میں نے اُن کے تیوروں کو اتنا خشم ناک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی عالم میں انھوں نے کہا ——

"تُم کسی اور سے پڑھو!"

یہ کہہ کر انھوں نے جاتے ہوئے غضب و غُصّہ کی نگاہ مجھ پر ڈالی —— حقارت آمیز نگاہ —— کہ اُسے الفاظ میں بیان کرنا مُمکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی دینی غیرت و حمیت ہر کسی کو عطا فرمائے! (آمین!)

اس واقعے کا اب خیال آتا ہے تو خدا جانتا ہے، کتنی ندامت ہوتی ہے۔ نجی محفلوں اور صُحبتوں میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان جب دین کا مذاق اُڑاتے ہیں تو ندامت کے مارے میری پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے کہ ایک دَور مجھ پر بھی ایسا گزرا ہے۔ دینی علوم و مسائل سے یہ نوجوان بالکل کورے ہوتے ہیں، مگر اس جہل و بے خبری کے باوجود دین کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ گفتگو اور گستاخانہ رائے زنی کرتے ہیں —— کس قدر عجیب اور تلخ حقیقت ہے —— کہ عدالتوں کے نظائر، مجسٹریٹوں اور ججوں کے فیصلوں پر کوئی اعتراض وارد کرے تو ضابطۂ تحریر اُسے "توہینِ عدالت" کا مُجرم قرار دیتا ہے مگر اس ناانصافی اور تضاد کو کیا کہیے کہ

اللہ، اُس کے رسولؐ، اکابرِ دین اور شریعت
پر جو لوگ زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، اُن پر کوئی روک
ٹوک نہیں۔

سر سیّد مراتب علی شاہ

سیّد وزیر علی شاہ مرحوم کے لائق اور بلند اقبال فرزند۔ آبائی وطن لاہور۔ کوچہ ٹوبیاں واقع بزّاز ہٹّہ کے مختصر سے خاندانی مکان میں پیدا ہوئے اور اِس دُنیائے آب و گِل اور عالمِ رنگ و بُو میں جدّوجہد اور کامیابیوں سے بھرپور زندگی گزار کر اپنی عظیم الشّان قیام گاہ "نشیمن" میں ۲۲ رمئی ۱۹۶۱ء کی شام کو داعیِ اجل کو لبّیک کہا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کی زندگی ایسے واقعات کا مرقّع ہے جن میں عبرت و نصیحت کے گوناگوں پہلو نظر آتے ہیں۔ اُن کے حالات سبق آموز ہیں اور اقوال بڑے کارآمد، مفید اور قیمتی۔

میرے نانا فقیر سیّد افتخار الدّین جو اپنے وقت کی قابلِ ذکر شخصیّت تھے، اپنی منجھلی لڑکی، یعنی میری خالہ، سیّدہ مبارک بیگم کے لیے کسی اعلیٰ خاندان کے رشتے کی تلاش میں تھے۔ ہر باپ اپنی بیٹی

کے لیے اچھّے سے اچھّا بَر چاہتا ہے۔ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ فقیر سیّد حسنُ الدّین مرحُوم نے ایک دِن میرے نانا کے سامنے سیّد مراتب علی کا ذِکر کرتے ہوئے کہا کہ لڑکا نیک ہے، لائق ہے۔ مانا کہ اُس کی مالی حالت کمزور ہے، مگر چہرے اور بشرے سے ہونہار اور کماؤ پُوت معلُوم ہوتا ہے۔ نانا مرحُوم اُس وقت اعلیٰ سرکاری عہدیدار تھے۔ قدرت نے اُن کو جوہر شناسی کا خاص ملکہ دِیا تھا۔ زندگیوں اور سِیرتوں کے پڑھنے کا فن اُنھیں آتا تھا۔ فقیر سیّد حسنُ الدّین سے تو اُنھوں نے ہاں یا ناں، کچھ نہیں کہا۔ اُن کی بات خاموشی کے ساتھ سُنتے رہے، مگر یہ بات اُن کے ذہن میں محفُوظ رہی اور ایک دن اپنے ایک دوست کے ذریعے سیّد مراتب علی کو دیکھنے کے لیے بلوایا۔

تھوڑی سی دیر کی مُلاقات اور بات چیت سے وہ اِس درجہ متأثّر ہُوئے کہ نوکر کو زنان خانے میں بھیج کر چند اشرفیاں منگوائیں اور سیّد مراتب علی کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ یہ اُس زمانے کی رسم تھی کہ رِشتہ پکّا ہو گیا۔ بس اِس کے بعد دُوسرا مرحلہ نکاح کا ہو گا۔

اِس طرف سیّد مراتب علی خوش اور مُطمئِن واپس ہُوئے اور اُدھر میرے نانا گھر میں تشریف لائے۔ اُنھیں دیکھتے ہی اُن کی والدہ نے کہا ـــــ

"میاں! تم نے مُبارک بیگم کا رِشتہ تو طے

کر دیا، مگر کچھ دیکھا بھالا بھی ہے ؟"

فقیر افتخارُالدّین نے جواب دیا ـــــ

"امّاں! لڑکا شریف ہے۔ اُس کا جسم جوانوں والا اور سر ایک پختہ بزرگ کا سا ہے۔ (یعنی اپنی قوّتِ بازُو سے کمائے گا، سوچ سمجھ کر خرچ کرے گا اور ترقّی کی نئی نئی راہیں نکالے گا۔)

شادی ہو جانے کے سال ہا سال بعد سیّد مراتب علی صاحب نے ایک دن خود مجھ سے بیان کیا کہ فقیر سیّد افتخارُالدّین نے جب پہلی مرتبہ مجھے دیکھنے کے لیے بُلوایا تھا تو مَیں جو کوٹ پہنے ہُوئے تھا، اُس میں ٹانکے لگے ہُوئے تھے، لیکن فقیر سیّد افتخارالدّین نے اُس پر کوئی توجّہ نہ دی۔ (اُن کی نگاہِ جوہر شناس تو اُس نوجوان کی لوحِ پیشانی پر اُس کے شاندار مستقبل کی تحریر پڑھ رہی تھی۔)

اِس واقعے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیّد مراتب علی اچّھا کوٹ پہن نہیں سکتے تھے یا معاشی حالات کی ابتری کے باعث اِس قدر مجبُور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وُہ فطری سادگی اور انکساری کے باعث ایسا کرتے تھے اور خود اپنے قول کے مطابق وہ اپنی شخصیّت کو ملمّع چڑھا کر اپنے خُسر کے سامنے پیش کرنا نہیں چاہتے تھے۔

میری خالہ کی شادی ۱۹۰۹ء میں ہُوئی اور میرے خالُو ۱۹۶۱ء

میں انتقال فرما گئے۔ رفاقت کی اِس ۵۷ سالہ مدّت میں مرحوم نے میری خالہ کے ساتھ، جو بفضلہٖ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں، جس حُسنِ سلوک کا مظاہرہ اور محبّت آمیز شریفانہ برتاؤ کیا وہ کم جوڑوں کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ شوہر کی پرستار اور یہ بیوی کے اِنتہائی قدر شناس۔ تعلقات کی اِس خوشگواری نے گھر کو جنّت نشان بنا دِیا۔ میرے خالو بار بار اِس بات کو دُہراتے تھے کہ مَیں اپنے خُسر کی عالی ظرفی اور احسان وکرم کو بھول نہیں سکتا۔ فقیر سیّد افتخارُالدین کا نام ہمیشہ بڑے اِحترام سے لیتے اور اُنھیں اپنا محسن بتاتے۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ مرتے دم تک اُن کے اِن خیالات میں ذرا سا بھی فرق رُونما نہیں ہُوا۔

میرے نانا کے ہاں اُس وقت تک اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اُن کے تین بیٹیاں تھیں، جن کی بیاہ شادی کی ذمّے داری سے وُہ فارغ اور آسُودہ خاطر ہو چکے تھے۔ اِس لیے گھر کے اِخراجات کے مُعاملے میں وُہ محتاط نہ تھے۔ جس کام میں پیسہ خرچ ہونا چاہیے اُس پر ایک آنہ صَرف کیا جاتا۔ کِسی سخت وقت کے لیے روپیہ پیسہ جوڑ کر رکھنے کا خیال ہی نہ آتا۔ سیّد مراتب علی صاحب نے اپنا کاروبار شرُوع کر دِیا تھا۔ اُن کی محنت، ذہانت و قابلیّت اور اللہ تعالیٰ کے فضل کی بدولت تھوڑے ہی دِنوں میں کاروبار خُوب چمک گیا۔ وُہ جب بھی لاہور آتے تو سُسرال کے گھریلو اخراجات اپنی نگرانی میں لے لیتے۔ بڑی کفایت شعاری اور احتیاط سے پَیسہ

اُٹھاتے اور پائی پائی کا باقاعدہ حساب رکھتے۔ جب اُن کے لاہور آنے کی اِطّلاع فقیر افتخارُالدّین کو مِلتی تو اپنے مُلازمین سے کہتے "جو کچھ خرچ کرنا ہے کرلو، کل سے یہاں مراتب علی کا راج ہوگا۔"

اُوپر ذکر آچکا ہے کہ فقیر افتخارالدّین برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستان کے سفیر بنا کر افغانستان بھیجے گئے تھے۔ اُنھی دِنوں سیّد مراتب علی لاہور میں سخت بیمار ہوگئے۔ فقیر سیّد افتخارُالدّین کو داماد کی بیماری کی اِطّلاع ملی تو اُن کی پریشانی اور تردّد کی کوئی حد نہیں رہی۔ اُس زمانے میں ڈاک تیز رفتاری سے پہنچنے کے اِنتظامات ایسے نہ تھے جیسے آج کل ہیں۔ اکثر مقامات پر پیادہ پا ہرکاروں اور ڈاک کے گھوڑوں کے ذرِیعے کاغذات اور خط پتر آتے جاتے تھے۔ فقیر افتخارُالدّین اپنی ڈاک کے سفارتی تھیلے کے اِنتظار میں رہتے اور اکثر یہ دھڑکا لگا رہتا کہ خدانخواستہ کہیں کوئی پریشان کُن خبر نہ آجائے۔ ہر بیماری اور مرض کے دو ہی رُخ ہوتے ہیں۔ صحت یا موت۔ امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان سے اُن کے بڑے گہرے مراسم تھے، بلکہ یُوں کہیے دوستانہ تھا۔ ارکِ شاہی میں اُن کا آنا جانا رہتا۔ امیرِ موصُوف اُن کو پریشان اور فکرمند دیکھ کر اس پریشانی کی وجہ معلُوم کرنے کے لیے بہت مُصر ہُوئے تو اُنھوں نے کہا "میرا خویش مراتب علی لاہور میں سخت علیل ہے۔ مَیں نے اللہ تعالیٰ کے حضُور دُعا کی ہے اور یہ نذر مانی ہے کہ وُہ شافیِ مطلق اپنے فضل و کرم سے اُس کو

صحت یاب فرما دے تو میں آپ کی اجازت سے جیل کے تمام قیدیوں کو کھانا کھلاؤں گا۔" اللہ تعالیٰ نے اپنے در کے فقیر کی دُعا قبول فرمائی اور چند دن کے بعد لاہور سے یہ اچھی خبر ملی کہ سیّد مراتب علی صاحب صحت یاب ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُنھیں بیٹا عطا کیا ہے۔ اِس نو مولود کا نام امجد علی رکھا گیا۔ یہ وُہی سیّد امجد علی ہیں جو پاکستان کے وزیرِ خزانہ رہ چکے ہیں اور آج کل اقوامِ متّحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔

سیّد مراتب علی خاص کردار اور منفرد صفات کے آدمی تھے۔ اُن کی ساری زندگی اِس اصول کا نمونہ تھی کہ انسان کی پیدائش کا مطلب انسانیت کی حفاظت کرنا ہے۔ بے کار رہنا اور یُونہی بیٹھنا تو اُن کو آتا ہی نہ تھا۔ زندگی کے ہر لمحے کو کام میں لانے کا گُر اُن کو خوب آتا تھا۔ یہ مسلسل محنت اور لگاتار کوشش کا نتیجہ ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مختصر عرصے میں ہی وسیع کاروبار اور جائداد کا مالک بنا دیا۔ جو تجارت ہاتھ میں لی، اُسے کامیاب اور منفعت بخش بنا کر دکھایا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں عطا فرمائیں۔ ہر ایک سے انھیں اس قدر پیار تھا کہ ہر اولاد یہی سمجھتی تھی کہ والدِ بزرگوار سب سے زیادہ مجھی کو چاہتے ہیں۔ اُن کی تفریح کوئی نہ تھی۔ کاروباری مشاغل کے بعد باقی تمام وقت وہ بچّوں کا سمجھتے۔ بیوی اور بچّوں کے پاس بیٹھنا ہی

اُن کی سب سے بڑی تفریح تھی۔

اُنھیں غصّہ بہت کم آتا اور آتا تو اُس پر قابُو پاتے۔ کبھی غلط اور جذباتی فیصلے کے مُرتکب نہ ہوتے۔ جیسا کہ قرآنِ حکیم کی ایک آیت کا مفہوم ہے —

"جو لوگ آسُودگی اور تنگی میں (خُدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں، اور سخت غضب کو دبا لینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے مَحبت کرتا ہے"۔

وُہ بھی غُصّے پر اِسی طرح قابُو پاتے کہ یا تو وہ جوشِ برہمی بالکُل ختم ہو جاتا ورنہ اس سے کِسی کو نقصان نہ پُہنچنے دیتے۔ کِسی مُلازم سے کوئی غلطی ہو جاتی تو عام طَور پر اُسے سمجھاتے اور آئندہ باز رہنے کی ہدایت کرتے۔ مَیں نے اُنھیں قہقہہ لگا کر ہنستے ہُوئے بہُت کم دیکھا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ مُسکرا دیتے!

سیّد مراتب علی صاحب مرحُوم ہمارے پُورے خاندان میں سب سے زیادہ شفقت و مہربانی خاکسار راقم الحرُوف پر فرماتے تھے۔ سالہا سال اُن کی رفاقت کے مواقع میسّر آتے رہے ہیں۔ مَیں نے اُنھیں قرِیب سے بلکہ بہت قرِیب سے دیکھا ہے۔ اگر یہ کہُوں تو کوئی مُبالغہ آمیز بات نہ ہو گی کہ مُجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتے اور میری بہتری کے لیے کوشاں رہتے۔

ایسے شفیق بُزرگ بس اب قِصّہ کہانی بن کر رہ گئے ہیں۔ اُن کے قیمتی مشوروں کو مَیں بھُولنا چاہُوں تو بھی نہیں بھُول سکتا کہ اُنھوں نے میری زندگی بنائی ہے۔ ہمارے گھر کی مالی حالت اُن دنوں کمزور تھی، لیکن وہ اپنی دولت وثروت کے باوجود اِس فرق کا کبھی احساس نہ ہونے دیتے۔ سب سے زیادہ تلقین، نصیحت اور ہدایت اِس بات کی کرتے کہ "دیکھو، جھوٹ کبھی مت بولنا"۔۔۔

دولت کے بارے میں اُن کا یہ قول تھا کہ۔۔۔

"دولت انسان کو بہُت سی تکلیفوں اور مصیبتوں سے بچاتی ہے۔ اِس کو اِحتیاط سے دیکھ بھال کے خرچ کرنا چاہیے۔۔۔

لیکن

خُدا کی راہ میں خرچ کرنے میں نہ تو کبھی دیر کرو نہ اِس مُعاملے میں کفایت شعاری سے کام لو"۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مَیں اُن کے ہمراہ موٹر میں لاہور کے مشہُور بازار انارکلی سے گزُر رہا تھا۔ ایک شخص کو دیکھا کہ پھُولوں کے گجرے اور ہار بیچ رہا ہے۔ اُنھوں نے موٹر رُکوائی۔ ہار بیچنے والے سے قیمت پُوچھی۔ اُس نے کہا، "ایک ہار کے دام دو پیسے"۔ سیّد صاحب نے کہا، "میاں! تین پیسے کے دو ہار دو تو ایک درجن ہار ہمارے"۔ اُس شخص نے شاہ

صاحب پر اور اُن کی موٹر پر عجیب طرح کی نگاہ ڈالی اور سر ہلا کر انکار کر دیا۔ شاہ صاحب نے قیمت میں ایک پیسے کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ نہ حجّت و تکرار کی نوبت آنے دی۔

تقسیمِ ہند کے بعد قیامت خیز ہنگامہ ہوُا۔ اُس کی لپیٹ میں اُن کی بھی لاکھوں رُوپے کی جائداد آ گئی۔ فیروز پور، بھوپال اور بعض دُوسرے مقامات پر اُن کی جائداد اُس ہندوستان میں رہ گئی، جسے اب "بھارت" کہتے ہیں اور جہاں یُونین جیک کی طرح ترنگا جھنڈا لہراتا ہے۔ کوئی دُوسرا شخص ہوتا تو اِس عظیم نقصان پر زندگی بھر کفِ افسوس مَلتا، مگر مَیں نے اُن کی زبان سے ایک دفعہ بھی اِس نقصان کا ذِکر نہیں سُنا، جیسے اُن کے ساتھ کوئی مُعاملہ ہی پیش نہیں آیا۔ ایک طرف پھُولوں کے ہاروں کی خریداری میں جُزرسی اور کفایت شعاری اور وہ اِس لیے کہ اُس کی نوعیّت ذاتی تھی۔ لیکن لاکھوں کی جائداد کا نقصان اُنھوں نے قوم کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کر لیا۔

اُن کی اقبال مندی اور دولت و ثروت کی کوئی حدّ و نہایت نہ تھی۔ مگر طبیعت بڑی سادہ اور تکلُّفات سے ناآشنا تھی۔ آخری عُمر میں کسی دعوت یا شادی میں شرکت کے لیے جاتے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے۔ کھانے کا وقت آتا تو میزبان اُن کے پاس آ کر کہتا کہ شاہ صاحب! کھانا تیّار ہے۔ فرماتے: بھائی! مَیں تو بہُت دِنوں سے ضُعفِ

معدہ کا مریض ہوں۔ ڈاکٹر نے کھانے پینے کے مُعاملے میں سخت پرہیز کی ہدایت کی ہے۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے فرماتے ــــ

"یہ میرا عزیز ہے۔ کھانا یہ کھائے گا"

مَیں وُہ منظر بھُول ہی نہیں سکتا کہ مَیں خوُب جی لگا کر کھانا کھا رہا ہُوں اور وہ میزبان مُجھ بن بلائے مہمان کو خاص نظروں سے دیکھ رہا ہے ــــ کاش! اُن "نظروں" کا کوئی نام رکھا جا سکتا۔

اِس سے پہلے عرض کر چُکا ہُوں کہ میری خالہ سے جب اُن کی شادی ہُوئی ہے تو اُس وقت اُن کی مالی حالت بہتر نہ تھی۔ اُن دنوں اُنھیں کاروبار کے سلسلے میں مُتحدہ ہندوستان کے دُور دراز مقامات کا سفر کرنا پڑتا۔ آج دِلّی میں ہیں، کل کا دِن بھوپال میں گزرا اور تیسرے دن کی شام کو اُنھیں ناگپور میں دیکھا گیا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہر سفر اُن کے لیے وسیلۂ ظفر ثابت ہُوا۔ ایک دفعہ جب وہ باہر گئے ہُوئے تھے تو واپسی سے ذرا قبل اپنی بیوی کو خط تحریر فرمایا ــــ مجھے فوراً لکھو کہ تمھیں کیا چیز پسند ہے، تاکہ مَیں اُسے تمھارے لیے لے کر آؤں۔ خالہ نے اُس کے جواب میں لکھا کہ "جو رُوپیہ آپ اِتنی محنت وَمشقّت اور جانفشانی سے حاصِل کر رہے ہیں، اُسے مَیں اپنے لیے تحفہ تحائف میں ضائع کرنا نہیں چاہتی"۔ ــــ مرحُوم نے یہ چِٹّھی اپنے پاس حفاظت سے رکھّی اور جب اُن کے

مقدر نے یاوری کی اور روپیہ پیسہ کی فراوانی ہوئی تو وہ بیوی کی لکھی ہوئی اس چٹّھی کو جو ایک چھوٹے سے صندوق میں محفوظ تھی، نکال کر پڑھتے اور اپنے گزشتہ وقت اور زمانے کو یاد کرتے اور ہر سفر میں خالہ کے لیے زیادہ سے زیادہ تحفے لاتے۔

خالہ جان نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ اُن کی تعلیم و تربیت اُس زمانے کے گھریلو ماحول کے مطابق ہوئی ہے، لیکن قدرت نے اُن کو ذہنِ رسا بخشا ہے۔ خاص طور سے اُن کی رائے ہر معاملے میں بڑی جچی تُلی اور صائب ہوتی ہے۔ کسی سے بات چیت میں کوئی لغزش ہو جائے تو اُسی وقت اُس کی اصلاح فرما دیتی ہیں۔ مَیں ایک بار اُن کو اپنا ایک واقعہ سُنا رہا تھا۔ مَیں نے دورانِ گفتگو میں کہا کہ خالہ! زبان کی لگام عقل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اُنھوں نے مجھے فوراً ٹوکا اور میری بات کی اس طرح اصلاح فرما دی: "نہیں۔ تمام اعضاء کی۔" اُن کی گفتگو اور تحریر دونوں میں اس قدر پختگی اور سنجیدگی ہوتی ہے کہ بعض وقت حیران رہ جاتا ہوں۔ چلتی ہوئی باتیں کرنی تو اُنھیں آتی ہی نہیں۔ ایک ایک لفظ اس انداز سے بولتی ہیں، جیسے سنجیدگی، ذمّہ داری، متانت اور وقار، بہ یک وقت اُن کی زبان سے بول رہے ہیں۔ شوہر کی اطاعت گزار بلکہ فدائی و شیدائی؛ اُن کی آسائش اور آرام کا ہر وقت خیال۔ عام شوہروں کی طرح اس قسم کی شکایت کی نوبت ہی نہ آنے دی

کہ بیوی نے بچّے ہونے کے بعد شوہر کی محبّت بچّوں میں تقسیم کر دی۔ شوہر کی محبّت میں اُنھوں نے مامتا کو شریک نہیں ہونے دیا۔ مگر شوہر کے حقوق کی ادائگی کے ساتھ بچّوں کی تعلیم و تربیت کا بھی پُورا پورا خیال رکھّا۔ میاں بیوی کے اِس اتّحاد و اتّفاق اور پیار محبّت ہی سے تو گھر یلو جنّت کی تخلیق ہوتی ہے۔ سیّد مراتب علی اور اُن کی بیوی نے ۵۷ سال اِس جنّت میں گزارے۔ آخری وقت تک باہمی محبّت و اخلاص کی یہ کیفیّت قائم رہی کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا، جیسے اُن کی شادی چند دِن قبل ہُوئی ہے۔ شوہر اور بیوی کے مابین اِس قدر محبّت اور ہم خیالی کی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں۔

سیّد مراتب علی مرحوم کا سب سے بڑا "شوق" اور "عشق سامانی" جاننا مقصود ہو تو یہ اُن کی مہمان نوازی، دوست احباب کی تواضع اور پُر تکلّف دعوت تھی۔ کھانے پکوانے کے اہتمام میں خُود دِلچسپی لیتے۔ اُن کا دسترخوان وسیع و کُشادہ ہوتا اور انواع و اقسام کے لذیذ کھانے نہایت سلیقے سے پیش کیے جاتے۔ پھر ایک ایک مہمان کا خیال رکھتے اور کھانا کھانے میں مہمانوں کو کھانے کی طرف رغبت دِلاتے رہتے۔

اُن کا دل خشیّتِ الٰہی سے لبریز تھا۔ ہر کامیابی و ترقّی کو صِرف اللہ تعالٰی کا فضل و کرم سمجھتے اور شُکر بجالاتے۔ بات کرنے میں — 'اللہ کا کرم'، 'اللہ کی مہربانی'، 'اللہ کا فضل' — اُن کا تکیۂ کلام تھا۔

بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے خاص عقیدت تھی۔ دہلی میں حضرتِ خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہی قدس سرّہٗ، لاہور میں حضرتِ داتا گنج بخش ہجویری، رحمۃ اللہ علیہ اور اجمیر شریف میں حضرتِ خواجہ معین الدّین چشتی علیہ الرّحمۃ کے مزارات پر حاضری دیتے۔

سیّدنا امام حسین علیہ السّلام اور اہلِ بیتِ اطہار سے والہانہ عقیدت تھی۔ محرّم کی نویں تاریخ کو بڑے پیمانے پر مجالس کا اہتمام کرتے۔ دُور دُور سے واعظ، ذاکر اور چوٹی کے سوزخواں اور مرثیہ پڑھنے والے آتے۔ پُرتکلف کھانے کا لنگر تقسیم ہوتا۔ اکثر اوقات مجالس میں انتہائی ادب و احترام کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ ایک بار ڈیڑھ دو گھنٹہ اسی حالت میں گزرے تو کسی نے کہا کہ آپ تھک گئے ہوں گے۔ بیٹھ جائیں تو اچّھا ہے۔ جواب دیا: نہیں، اس دربار میں کھڑے ہونے کی سعادت سے مَیں اپنے کو محرُوم نہیں رکھنا چاہتا۔ وفات سے چند سال پیشتر بازار حکیماں، لاہور میں جہاں ہمارے آباؤ اجداد کے قدیم مکانات اور حویلیاں ہیں، کافی جائداد خرید کر امام باڑہ تعمیر کرایا اور اُس کا نام اپنی شریکِ زندگی کے نام پر "امام باڑہ سیّدہ مبارک بیگم" رکھا۔ جو اسی نام سے اب تک مشہور چلا آرہا ہے۔ آخرِ عمر میں ضعف و کبر سنی کے باوجود باہر کھڑے ہو کر مجالس سُنتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذکرِ حسینؑ اُن میں توانائی پیدا کر دیتا ہے۔

ضرورت مندوں اور مستحقین کی امداد و اعانت پوشیدہ طور پر کرتے۔ اس طرح کہ ایک ہاتھ کی دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اس معاملے میں اتنی احتیاط برتتے کہ اُن کی بیوی کو بھی اس کا علم نہ ہوتا۔ غیبت وہ مرض ہے جو ہماری قوم میں متعدی ہو چکا ہے، مگر سید صاحب مرحوم پیٹھ پیچھے کسی کا ذکر بُرے الفاظ میں نہ کرتے۔ درگزر اور عفو و کرم اُن کا شیوہ تھا۔ خود رائی اور اپنی بات کی پچ کے لیے اصرار کرنا، ان باتوں سے اُن کو طبعًا نفرت تھی۔ وہ اپنے بچوں تک سے مشورہ لیتے اور اپنی رائے کو حرفِ آخر نہ سمجھتے۔ کسی کی رائے پسند آجاتی تو اُسے بلا تأمّل قبول کر لیتے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں وہ ذرّہ برابر نہ ہچکچاتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اپنے بیٹوں کے سامنے اپنی رائے کی غلطی کو تسلیم کیا۔

مغربی مشروبات تو ایک طرف رہے، تمباکو نوشی تک سے اُنھوں نے کوئی سروکار نہ رکھا۔ ساری زندگی میں ایک بار میں نے انھیں پان کھاتے ہوئے دیکھا۔ جب کسی کے متعلق سنتے کہ فلاں شخص شراب پیتا ہے یا تمباکو نوشی کا عادی ہے تو کہتے: "بھائی، روٹی کا نشہ ہی پورا ہو جائے تو بڑی بات ہے"۔ مطلب یہ کہ خدا کے فضل سے کھانا میسّر آجائے تو یہی بڑی بات ہے اور انسان کو شکر ادا کرنا چاہیے۔

شاہ جی کا تعلق جس سے ایک بار قائم ہوا۔ اُسے اُنھوں نے آخر دم تک نبھایا۔ رشتہ داروں اور دوستوں میں جہاں کہیں خوشی یا غم

کا کوئی واقعہ ہوتا۔ شاہ صاحب شریکِ غم یا شریکِ مسرت ہونے کی کوشش کرتے۔ کسی عزیز کی موت پر اظہارِ افسوس یا کسی بیمار کی عیادت کے لیے جانا ہوتا تو اُس میں دیر نہ کرتے۔ اگر کبھی کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر رہے ہوں اور گھر میں سے کوئی فرد کہہ دیتا: آپ بہت تھکے ہوئے ہیں، کل یا پرسوں وہاں ہو آئیے تو جواب دیتے: "نہیں، میرا جانا ابھی ضروری ہے۔ ورنہ میرے ضمیر پر یہ تاخیر بوجھ بنی رہے گی۔" پھر فرماتے: "بھئی! آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔"

اکثر ایسا ہوتا کہ وُہ آرام کے لیے بستر پر لیٹے ہوتے تو مَیں اُن کے قریب بیٹھ جاتا۔ اُس وقت مختلف موضوعات پر مجھ سے گفتگو کرتے۔ لیکن اس کا انداز یہ ہوتا کہ گفتگو کا آغاز اُنھوں نے کیا ہے۔ اِس کے بعد میں اپنی فہم اور علم کے مطابق مختلف اُمور پر باتیں کر رہا ہوں اور وُہ نہایت اطمینان اور توجّہ کے ساتھ سُن رہے ہیں۔ یکایک مَیں دیکھتا ہوں کہ وُہ گہری نیند سو گئے ہیں۔ اُن کی یہ نیند قدرت کا خاص عطیّہ تھا۔ کمال ہوشیاری سے گفتگو کرنے ہیں اور گہری نیند میں ایک لمحے کا وقفہ نہ ہوتا۔ باتیں کرنے کے دوران یُوں سو جاتے جیسے بڑی دیر سے گہری نیند سو رہے ہوں۔ یعنی نیند کے لیے انھیں کبھی بھی کوشش اور جستجو نہیں کرنا پڑتی تھی۔ انسانی نفسیات کے اصُول کے مطابق اِس قدر پُرسکون نیند کا آنا اُن کے سکونِ قلب اور صحّتِ دماغ کی علامت تھی۔ ورنہ کاروباری طور

پر زیادہ مصروف اور متردّد لوگ عام طور پر اِس نعمت سے محروم ہوتے ہیں
بحیثیت والد اُن کا کردار بچّوں کے لیے بڑا اہم تھا۔ جوان بچّوں کی
عزّت کرتے تاکہ اُن میں عزّتِ نفس کا اِحساس قائم رہے۔ اپنے بچّوں کو
نصیحت کرنا ہوتی تو میری معرفت کہلواتے۔

اُن کے والد کا نام سیّد وزیر علی اور تایا کا نام سیّد احمد شاہ تھا۔
ایک صاحبِ سخن اُن سے ملنے کے لیے آئے اور باتوں باتوں میں اُنھوں نے
کہا؛ شاہ صاحب! لوگ شاعروں سے اپنے نام کا سجع لکھواتے ہیں۔ آپ
کے خاندان میں آپ کے تایا اور آپ کے والد کے نام ہی خود اپنی جگہ سجع
ہیں۔ کسی شاعر کا سجع کے لیے فکر کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔

شاہ صاحب نے دریافت کیا؛ "جی! وہ کیسے؟"

اُن صاحب نے کہا؛ "احمد شاہ، وزیر علی"۔

یہ سجع جس نے بھی سُنا، بے ساختہ داد دی۔ "شاہ" اور "وزیر" نے
اس سجع کی معنویّت میں کس قدر حُسن اور دِلکشی پیدا کر دی۔

سیّد مراتب علی مرحوم کے لیے بھی ایک شاعر نے سجع لکھ کر
بھیجا تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ سجع بھی آپ ہی اپنا جواب ہے

"بہ پُرس از محمّد مراتب علی را"

اِنتقال سے ایک دِن پیشتر بازارِ حکیماں تشریف لے گئے۔ خاندان
کے تمام لوگوں سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ میرے عزیز فقیر سیّد حسین الدین جن

کا حال ہی میں انتقال ہُوا ہے، سے مِلے، تو بڑے حسرت آمیز لہجے میں کہا :
بھائی جان ! اچھا ہُوا، آپ سے بھی مِل لیا۔ ایسا معلُوم ہوتا تھا جیسے وُہ زِندگی
کی آخری مُلاقات سمجھ کر مِل رہے ہیں۔ میں اُن دِنوں اتّفاق سے لاہور میں
موجُود تھا۔ چار بجے اُن کے اِنتقال کی اِطلاع ملی، اُن کے دونوں لڑکے
سیّد امجد علی اور سیّد واجد علی پاکستان سے باہر گئے ہُوئے تھے۔ سیّد
افضال علی اور سیّد بابر علی لاہور میں تھے۔ مشوَرہ ہُوا کہ اُنھیں دفن کہاں
کیا جائے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے دے رہا تھا کہ اِتنے میں مرحُوم کے
پرائیویٹ سکریٹری، محمّد شفیع نے کہا کہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔
شاہ صاحِب اِس کے بارے میں اپنی وصیّت چھوڑ گئے ہیں۔ چنانچہ اُن
کے کاغذات کو دیکھا گیا۔ کُچھ دیر کی تلاش و جستجُو کے بعد وُہ اصل درخواست
نکل آئی، جو اُنھوں نے ڈپٹی کمِشنر لاہور کے نام لِکھ کر محفُوظ کر دی تھی۔
اُس میں لکھا تھا کہ اُنھیں اور اُن کی بیوی کو امام باڑہ مبارک بیگم میں دفن
کرنے کی اِجازت دی جائے۔ اِس وصیّت اور درخواست کے مطابق
حُکّامِ متعلقہ سے تھوڑی سی دیر میں اِجازت حاصِل کر لی گئی اور اُن کی
آخری خواہش پُوری ہو کر رہی۔ امام باڑہ مبارک بیگم کی زمین اُن کا
مدفن، مقبرہ اور آخری آرام گاہ بن گئی ــــــ رہے نام اللہ کا !

یہی وہ مقام ہے جہاں وہ وفات سے ۷۵ سال قبل دُولھا
بن کر آئے تھے اور یہیں سے میری خالہ رُخصت کی گئی تھیں۔

اگر کوئی شخص مجھ سے کہے کہ مَیں سیّد مراتب علی شاہ مرحُوم کی زندگی کا خلاصہ اور لبِّ لباب ایک فِقرے میں بیان کر دُوں ، تو میں یہ کہوں گا ـــــ

"اِس بزُرگ نے جو نصیحت دُوسروں کو کی اُس

پر خُود بھی عمل کیا۔"

مَیں نے اِس عبارت کو کَتبے کی صُورت میں اُن کے مرقد پر نصب کرنے کا انتظام کیا ہے۔ کیا عجب ہے، اُن کی زِندگی کے اِس اصُول کو پڑھ کر کسی شخص کے دِل کی گرہ کھُل جائے اور اُس کی اِصلاح ہو جائے۔

میاں فضل حسینؒ

میاں سر فضل حسین مرحوم کا نام، کام اور اُن کی ممتاز شخصیت، کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے —— اُنھوں نے پنجاب میں مُسلمانوں کی ترقی و سربلندی کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں، اُن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ یہ کارنامے ایک طرف فراست و ذہانت کی دلیل ہیں، دُوسری طرف اُن کی قومی دردمندی کا ثبوت ہیں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارمز کے نفاذ کے بعد جب پنجاب میں صُوبائی وزارتوں کا قیام عمل میں آیا اور میاں فضل حسین کو قلمدانِ وزارت تفویض ہُوا تو سب سے پہلے اُنھوں نے اُس ناانصافی کے خاتمے کے لیے قدم اُٹھایا جو انگریزی دَور میں سال ہا سال سے مُسلمانوں کے ساتھ روا رکھّی جا رہی تھی۔ اِس جدّ و جہد میں اُنھوں نے حالات کی ناسازگاری کی پروا نہیں کی اور مخالفین اُن کے فولادی عزم میں لچک پیدا نہیں کر سکے۔ شعبۂ تعلیم میں مُسلمانوں کی

ابتری اور زبوں حالی کے ازالے کے لیے اُنھوں نے یہ تدبیر سوچی اور اِس مسئلے کا یہ حل نکالا — کہ سرکاری طور پر احکام جاری کیے کہ تمام اسکولوں میں چالیس فی صد نشستیں مُسلمان طلباء کے لیے مخصُوص کر دی جائیں۔ اِس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں مُسلمانوں کا جو افسوسناک اور حوصلہ شکن تناسب تھا، اُسے درُست کیا۔ دُوسرے فرقوں کے لیے میاں صاحب کی یہ روش غیر متوقّع اور حیران کُن تھی۔ بلکہ سببِ آزردگی اور وجہِ ملال بھی۔ اُنھوں نے اِعتراضات اور شکایات کی بوچھاڑ شرُوع کر دی۔ اِس طُوفانی اِحتجاج کے مُقابلے میں میاں سر فضل حُسین چٹان بن کر جمے رہے۔ پنجاب میں تعلیمی سہُولت کے اس انقلابی قدم کی بدولت مُسلمانوں کی نئی نسل کو عزّت و ترقّی کے شاندار مواقع ملے۔

وزارت ملنے سے قبل ہی اُن کی سُوجھ بُوجھ کا یہ عالم تھا کہ ایوانِ حکومت میں اُن کے مشوروں اور معاملہ فہمی کی پُوری قدر کی جاتی۔ جن دنوں پہلی جنگِ عظیم قریبِ اختتام تھی، حکومت نے جنگ کے سلسلے میں قابلِ ذکر خدمات انجام دینے والوں کی قدر افزائی بلکہ حوصلہ افزائی کے خیال سے اُنھیں انعام و اکرام سے نوازنے کا فیصلہ کیا۔ میاں فضل حسین کو جب حکومت کے اس ارادے کا علم ہُوا تو اُنھوں نے گورنر کو تجویز بھیجی کہ اِنعامات اور اسناد ڈاک سے بھیجنے کی بجائے ایک دربار منعقد کر کے اُس میں تقسیم کی جائیں۔ اِس طرح عوام اور حکومت

کے روابط اور زیادہ خوشگوار ہوں گے۔ تجویز بڑی معقول اور بات بڑی نفسیاتی تھی۔ گورنر نے اِس تجویز کو بہت پسند کیا اور ہدایت جاری کی کہ یہ دربار ضلع شیخوپورہ میں منعقد کیا جائے اور اُس کی صدارت گورنمنٹ کے نمائندے کی حیثیت سے خود میاں فضل حسین کریں۔

اُن دنوں کمشنر کے عہدے پر Kenneway نام کا ایک انگریز فائز و متمکن تھا۔ یہ شخص بڑا ضِدّی، مغرور اور متعصب تھا۔ ایک تو حکومت کا نشہ اس پر گوری رنگت کا احساسِ برتری۔ کالے ہندوستانیوں کو تو زرخرید غلاموں سے بھی زیادہ ذلیل اور پست سمجھتا تھا ــــــ جب اُس کے پاس اِس جلسے کا یہ پروگرام پہنچا کہ ایک ہندوستانی مُسلمان اُس کے ہوتے ہوئے اِس جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دے گا تو وُہ سخت برہم اور برافروختہ ہُوا۔ اُس نے اپنے دل کے غُصّے کو سرکاری مراسلے کے ذریعے ظاہر بھی کر دیا۔ اُس نے لکھا ــــ

"ایک ہندوستانی، حکومت کے اعلیٰ نمائندے کی حیثیت سے اِس دربار کا صدر نشین بنے۔ مَیں اِس توہین آمیز منظر کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔"

میاں صاحب نے مسٹر کینوے کمشنر کا یہ جواب جُوں کا تُوں اپنی طرف سے ایک لفظ لکھے بغیر گورنر کی خدمت میں بھیج دیا۔ گورنر ایک معاملہ فہم اور با اصُول انگریز تھا۔ وہ اِس نکتے کو جانتا تھا کہ اپنے وطن سے

دور سات سمندر پار اور دُوسروں کے دیس میں بادشاہوں کی طرح عوام سے بالکل الگ تھلگ رہ کر حکومت کرنے میں اُلجھنوں، خطروں اور بدمزگیوں کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گورنر نے حکم دیا کہ

"مسٹر کینوے کو اِس امر کی اجازت ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی سے اِس مُعاملے میں اگر وُہ اتفاق نہیں رکھتے تو اپنے عہدے سے مُستعفی ہو کر چلے جائیں۔"

یہ کمشنر Kenneway بلا کا ضدّی اور خُود پسند انگریز تھا۔ اُس نے سرکاری مراسلہ پہنچتے ہی استعفٰے لکھا اور چند دن کے بعد کمشنری کا چارج دے کر ولایت واپس چلا گیا۔

یہ دربار مقرّرہ تاریخ پر منعقد ہُوا۔ اُس زمانے میں ایک ہندُوستانی کے لیے واقعی یہ بہُت بڑا اعزاز تھا، جسے میاں صاحب نے اپنی ذاتی لیاقت و تدبّر کی بدولت حاصل کیا۔

میاں فضلِ حسینؒ کو راقم الحرُوف نے پہلی بار ۱۹۲۳ء میں دیکھا، جب وُہ میرے ایک بزرگ فقیر سیّد ظفر الدّین مرحُوم ریٹائرڈ سُپرنٹنڈنٹ پولیس کی رسمِ فاتحہ خوانی میں ہمارے گھرانے میں تشریف لائے تھے۔ فاتحہ خوانی ہو چُکی تو میاں صاحب نے میرے بزرگ سیّد اصغر علی شاہ مرحُوم سے کہا کہ میں اِس مکان کو دیکھنا چاہتا ہُوں، جہاں طالب علمی کے زمانے مَیں اس خاندان کا مہمان رہا تھا۔ چنانچہ ہماری خاندانی

حویلی کے اُس حصّے میں اُنھیں لے جایا گیا۔ اسے دیکھ کر میاں فضل حسین پر ایک عجیب سا عالم طاری ہو گیا۔ جیسے اُن کا حافظہ گزشتہ یادوں کے اوراق اُلٹ رہا ہو۔!

اُس دن مجھے معلوم ہُوا کہ ہمارے خاندان کے بزرگوں سے میاں صاحب کے کس قدر قریبی تعلّقات رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد ایک دو بار نجی کام کے سلسلے میں اُن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ افراد کی بھلائی اور خاص طور سے قوم کی فلاح و بہبود اور رہنمائی کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے وُہ سب اُنھیں عطا فرمائے تھے۔

میاں صاحب کو خرابیِ صحت کی شکایت ہُوئی۔ یہاں تک کہ اس شکایت نے مُستقل بیماری کی صُورت اِختیار کر لی —— مرض نے اُنھیں نحیف و نزار ہی نہیں، خشک مزاج بھی بنا دیا تھا۔ وُہ صِرف قوم کی خدمت کرتے۔ فرد کی سفارش سے گریز کرتے —— کِسی نکتہ فہم بزُرگ نے اُن کی زندگی کے اِس پہلُو کی کتنے موزُوں اور حَسین الفاظ میں ترجمانی کی ہے ——

"میاں فضل حُسین کسی پیاسے آدمی کو پانی کا گلاس نہیں دیتے۔ کنوّاں لگوا دیتے ہیں تاکہ نہ صِرف وہ تنہا شخص بلکہ دُوسرے بھی اپنی ضرُورت کے مطابق

فائدہ اٹھاتے اور سیراب ہوتے رہیں"۔

راقم الحروف کے علم میں ایک ایسا واقعہ بھی ہے، جس نے میاں صاحب جیسے بااصول اور مستقل مزاج شخص کو آزمائش میں ڈال دیا تھا، مگر انھوں نے اصول شکنی پھر بھی گوارا نہیں کی۔

میرے دوست اور ہم جماعت ڈاکٹر نیاز احمد جو پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر اور ڈین رہ چکے ہیں، اور مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کو اُن کی خدمات بطور کنسلٹنٹ حاصل ہیں ــــ اُن کے والد شیخ سعید احمدؒ سے سر فضل حُسین کے گہرے مراسم تھے۔ شیخ سعید احمد جس زمانے میں چیف کورٹ میں سینئر ریڈر تھے، سر فضل حُسین بحیثیت ایڈووکیٹ مختلف مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں وہاں جاتے رہتے یہ تعلقات شروع میں پیشہ ورانہ تھے، لیکن بعد میں دوستانہ شکل اختیار کر گئے۔

نیاز احمدؒ ابھی بچے ہی تھے کہ اُن کے والد شیخ سعید احمدؒ کا انتقال ہو گیا اور اُن کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اُن کی والدہ کے کاندھوں پر آپڑا۔ اس محترم خاتون نے بڑی محنت، جانفشانی اور ایثارِ نفس سے کام لے کر نیاز احمدؒ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور یہ محض اس باہمت خاتون کی صبر و استقامت کا نتیجہ تھا کہ نیاز احمدؒ اپنے وطن میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تک پہنچے۔ میاں فضل حسین اپنے دوست سعید احمدؒ

مرحُوم کے گھر کے ان حالات اور مشکلات سے، جن میں نیاز احمدؒ تعلیم حاصل کرتے رہے، بخوبی واقف تھے۔

میرے دوست نیاز احمدؒ جب جرمنی سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری لے کر وطن واپس آئے تو یہ زمانہ میاں فضل حسین کے عرُوج اور کمال کا زمانہ تھا۔ اُن کا نہ صرف سرکارِ انگلشیہ کے قصر و اَیوان میں ایک خاص مقام تھا، بلکہ وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے وہ باقاعدہ ممبر اور ہاؤس کے لیڈر تھے۔ اُن کی بات اور اُن کی شخصیت بڑی اہم اور وقیع سمجھی جاتی تھی۔

ڈاکٹر نیاز احمدؒ نے واپس آتے ہی ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل انڈسٹریز میں ملازمت کی کوشش شروع کی، لیکن یہ فرم ہندو ذہنیت کے اس قدر زیرِ اثر تھی کہ وُہ کامیاب نہ ہوسکے۔ چُنانچہ ڈاکٹر نیاز احمدؒ میاں فضل حُسین سے جا کر ملے۔ میاں صاحب اُن لوگوں میں سے تھے، جو اپنے دوستوں اور محسنوں کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

اُس زمانے میں مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی میں ٹیرف بل زیرِ بحث تھا جس کا مقصد اِس قسم کی صنعتوں کو تحفّظ دینا تھا۔ اسمبلی کے اسپیکر سر ابراہیم رحمتُ اللہ، جو ٹاٹا اسٹیل کے ڈائرکٹروں میں سے ایک تھے، ہندوستان کی اسٹیل انڈسٹری کی بڑی حمایت کرتے رہتے تھے۔ میاں فضل حُسین نے جب ڈاکٹر نیاز احمدؒ کی زبانی ٹاٹا اسٹیل والوں کے

سخت جانبدارانہ طرزِ عمل کا حال سُنا تو بہت متاثّر ہُوئے۔ خندہ پیشانی کے ساتھ اُنھیں اپنے قریب بٹھایا اور فوراً ہی اسٹینو کو طلب کر کے ایک چِٹھی سر ابراہیم رحمت اللہ کے نام، جو اِتّفاق سے اُن دنوں بمبئی گئے ہُوئے تھے، لِکھوا کر اُنھیں دی۔ ڈاکٹر نیاز احمد میاں صاحب کا خط لے کر اُن کے پاس بمبئی پہنچے۔ خط کا خلاصہ یہ تھا ــــــ

"ڈیئر سر ابراہیم! میں آپ کا تعارف ڈاکٹر نیاز احمد D.Sc. (Hons.) سے کرا رہا ہُوں۔ یہ ایسی منفرد تعلیم سے آراستہ ہیں، جو غالباً ہمارے ہاں کسی دُوسرے نے حاصل نہیں کی ہے۔ آپ نے مجُھ سے کہا تھا کہ ٹاٹا اسٹیل انڈسٹری کسی طور بھی ہندُو فرم نہیں ہے اور یہ کہ اُس کے متعلق بعض حلقوں کا یہ تاثر بالکل ہی غلط ہے۔"

آگے لکھا تھا ــــــ

"اگر یہ اعلیٰ تربیت یافتہ نوجوان مذکورہ ادارے میں کوئی اچھی جگہ حاصل کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ اس اعتراض کا زیادہ صحیح اور مؤثّر جواب مِلا ہے۔"

ڈاکٹر نیاز احمد نے مجھے خود یہ واقعہ سنایا کہ جب وُہ میاں فضل حسین کا یہ معنی خیز تعارفی خط لے کر سر ابراہیم رحمت اللہ کے پاس بمبئی پہنچے، تو وُہ اسے پڑھ کر بہت متاثّر ہُوئے اور اُنھوں نے فوراً ہی

مسٹر جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا کو ٹیلیفون کیا۔ اُن کی مُلاقات مس ٹاٹا سے ہُوئی۔ سر ابراہیم نے کہا: آپ لوگ اِس قسم کے معاملات میں تنگ نظری سے کام لے کر اسٹیل انڈسٹری کے مفادات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اُن کا لہجہ بہت واضح اور مؤثّر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر فضل حُسین کا یہ جُملہ کہ "آپ نے مُجھ سے کہا تھا، ٹاٹا اسٹیل انڈسٹری کسی طور بھی ہندو فرم نہیں ہے اور اس کے متعلق بعض حلقوں کا یہ تاثّر بالکل ہی غلط ہے" اُن کے دل میں ایک ایسی کھٹک اور چُبھن بن گیا ہے، جسے وُہ شِدّت سے محسُوس کر رہے ہیں۔

سر ابراہیم کی یہ کوشش کامیاب رہی اور ڈاکٹر نیاز احمد کو وہاں اچھی ملازمت مِل گئی اور یہ کام اِس خوبی سے ہُوا کہ سر فضل حسین کا دامن جانبداری، دوستانہ دباؤ اور سفارش کے عیب سے بالکل پاک رہا۔

ایک اور واقعہ جس سے اُن کے اصول و کردار کی خوبی ظاہر ہوتی ہے، سنیے ــــ میاں فضل حسین کے بڑے لڑکے میاں نسیم حسین نے آئی۔ سی۔ ایس (I.C.S.) کا امتحان دیا۔ وہ اس میں کامیاب تو ہو گئے لیکن کامیاب امیدواروں میں نمبروں کے لحاظ سے فہرستِ انتخاب میں اُن کا نام نہ آ سکا۔ عزیزوں اور دوستوں نے اِس مُعاملے کو میاں فضل حسین کے گوش گزار کیا کہ وہ اگر وائسرائے کو اشارہ کر دیں تو نسیم حسین ضرور منتخب

ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ کامیاب تو ہو چکے ہیں، نمبروں کی ترتیب
کی بس ذرا سی دشواری پیش آ رہی ہے، جسے وائسرائے دور کر سکتے ہیں۔

میاں فضل حسین نے اپنے صاحبزادے میاں نسیم حسین کو بلایا
اور کہا: میں نے وائسرائے سے آج تک اپنے کسی ذاتی کام کے لیے
نہیں کہا۔ یہی وجہ ہے کہ اصول و انصاف کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے
تو میں پوری اخلاقی جرأت کے ساتھ اپنی رائے پر جم جاتا ہوں اور
میری بات مان لی جاتی ہے۔ اگر میں نے اپنے ذاتی معاملے میں سفارش
کر کے اُسے منظور کرا لیا تو میری جرأت میں لچک پیدا ہو جائے گی۔ مجھے
وائسرائے کا ممنونِ احسان ہونا پڑے گا اور معلوم نہیں کہ اس عنایتِ خاص
کے عوض مجھے کسی ایسے کام کی حمایت و تائید کے لیے جھکنا پڑے، جو
قومی مفاد کے خلاف ہو۔

میاں صاحب اپنے اصول پر قائم رہے اور اپنے لڑکے کے لیے
وائسرائے سے سفارش نہیں کی۔ ان واقعات میں نئی نسل کے لیے عبرت
و نصیحت ہے۔ خاص طور سے سرکاری طبقے کے لیے تو اس قسم کے واقعات
قابلِ عمل نمونہ ہیں۔

میاں صاحب کے زمانے میں جب پہلی مرتبہ زرعی اصلاحات کا
منصوبہ سامنے آیا تو اُس وقت کی صوبائی کونسل کے ارکان اور بڑے بڑے
زمیندار اکٹھے ہو کر میاں فضل حسین کے پاس گئے اور اُن سے شکایت

کی کہ ہمیں آپ سے ایسی توقع نہ تھی کہ ہماری گردن پر آپ اِس طرح چھُری چلادیں گے۔ راقم الحرُوف کے عزیز میجر مبارک علی شاہ بھی اِس وفد میں شامل تھے۔ میاں صاحب نہایت وقار و متانت کے ساتھ وفد کی شکایتیں سُنتے رہے۔ جب وہ لوگ اپنی بات کہہ چکے، تو میاں صاحب نے فرمایا ——

"میری نگاہ آنے والے زمانے پر ہے۔ یہ خواب ایک نہ ایک دن شرمندۂ تعبیر ہو کر رہے گا —— اِن اِصلاحات میں تاخیر پیدا کی جاسکتی ہے، مگر اِن کو روکا نہیں جاسکتا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ لوگ اپنی سالم روٹی میں سے چوتھائی حِصّہ دُوسروں کو دے کر اپنی زمینداری کی عُمر بڑھالیں۔ بہ نسبت اِس کے کہ ایک دن پُوری کی پُوری روٹی دینے پر آپ کو مجبُور کیا جائے۔"

کونسل میں میاں صاحب نے ہندُو جاٹ گروپ قائم کرایا اور اس کا لیڈر سر چھوٹُو رام کو چُنا۔ یہ پنجاب کے اُس علاقے سے تعلّق رکھتے تھے، جو بہُت پسماندہ تھا۔ اس لیے اس گروپ کی بدولت علاقۂ مذکُور کو نسبتاً زیادہ فائدہ پہنچا۔ سر چھوٹُو رام نے بھی میاں صاحب کے ساتھ بڑی سرگرمی کے ساتھ تعاون کیا۔ بعض مُسلمان میاں صاحب کی اِس روِش پر کبیدہ خاطر ہُوئے اور بات شکوہ و شکایت تک جا پہنچی۔

میاں صاحب نے اِس پر بڑے دلچسپ انداز میں فرمایا ——

"آدمی ہے کام کا گو نام چھوٹو رام ہے"

میاں فضل حسین جب بیمار ہو گئے اور یہ بیماری مرض الموت ثابت ہُوئی تو اُن دنوں وہ ڈاکٹر امیر چند کے زیرِ علاج تھے۔ مرنے سے ایک دو دِن پہلے کرنل امیر چند نے اُن کا معائنہ کیا اور کہا: "آپ کی صحت اب اچھی ہے۔ خُدا نے چاہا تو آرام ہو جائے گا۔"

میاں صاحب اِس پر بولے: "یہ تو اب 'گپ شپ' معلوم ہوتی ہے۔"

کرنل امیر چند نے کہا: "حیرت ہے، آپ جیسی قوّتِ ارادی کا آدمی ایسی بات کہتا ہے۔"

میاں صاحب نے جواب دیا: "وُہی (قوّتِ ارادی) تو اب ختم ہو چکی ہے۔"

موت جب آتی ہے تو ڈاکٹروں کی مسیحائی، بڑے بڑے داناؤں اور فلاسفروں کی حکمت و دانش، شہرت، دولت اور حکومت و فرمانروائی کچھ کام نہیں آتی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہر حال میں پُورا ہو کر رہتا ہے۔ میاں صاحب نے اپنی زندگی کے بارے میں جس مایُوسی کا اظہار کیا تھا، وہ بے معنی نہ تھی۔ ہر قسم کے علاج اور کوشش کے باوجود بالآخر وہ وقت آ پہنچا۔ جب میاں فضل حسین

نے داعیِ اجل کو لبّیک کہا ——

یہ وہ ہستیاں ہیں، جنھوں نے دولت و وجاہت کی بجائے انصاف، دیانت اور عزّتِ نفس کو زندگی کا اصل سرمایہ سمجھا اور کردار کی پاکیزگی اور بلندی کو دنیا کے تمام مفادات اور اعزازات پر مقدّم رکھا ——

اللہ تعالیٰ انھیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے!

سر سکندر حیات خاں

سر سکندر حیات خاں کی ذات پنجاب کی تاریخ کا ایک مُستقل باب ہے۔ اِن مختصر صفحات میں دورِ سکندری کی تفصیلات کہاں سما سکتی ہیں۔ راقمُ الحرُوف تو اپنے ذاتی تأثرات اور یادداشتیں نذرِ قارئین کر رہا ہے۔

انگریزی حکومت میں سر سکندر کو جو اِقتدار، قُربت اور اِعتماد حاصل تھا، وُہ کِسی ہندوستانی کو شاید کم ہی میسّر آیا۔ اِس قدر جاہ و منصب کے باوجُود وُہ بڑے خلیق اور ملنسار آدمی تھے۔ جن دِنوں اُنھیں پنجاب کا گورنر بنانے کی تجویز زیرِ غور تھی، انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسروں کا طبقہ اِس تجویز کا شدید مُخالف تھا۔ ایک ہندوستانی کی ماتحتی میں کام کرنے میں وُہ اپنی سُبکی محسُوس کرتے تھے، مگر سرکارِ برطانیہ نے اپنی پالیسی کے مُقابلے میں اِس مُخالفت کی پروا نہیں کی اور سر سکندر حیات پنجاب کے

قائم مقام گورنر بنا دیے گئے۔ انگریزی دَور کی گورنری ایک بادشاہت تھی، اِس لیے عُہدۂ جلیلہ کے تقرّر کی خبر آخر وقت تک راز میں رکھی گئی۔ سیکریٹری آف اسٹیٹس، جن کا دفتر لندن میں تھا، اُن کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وُہ اِس مُعاملے میں کب اور کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ ایک دِن سر سِکندر حیات خان اپنے دفتر میں کام کر رہے تھے۔ اُنھیں ٹیلیفون پر اِس تقرّر کی اِطّلاع دی گئی۔ مرحُوم نے اِس خبر کے سُنتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنی کُرسی سے اُٹھ کر سر بسجُود ہو گئے اور خُدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے یہ عزّت بخشی ہے۔ عزّت اور ذِلّت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جس کا یہ عقیدہ ہے، وُہ شکر و صبر کے تقاضوں کو پہچانتا ہے اور اُس کا مُعاملہ بندوں کے ساتھ تکبّر و خُود پسندی کا نہیں ہو سکتا۔ ہاں! جو کوئی ہر کامیابی کو اپنی کوشِشوں کا نتیجہ سمجھتا ہے، وُہ "فِرعون" بن جاتا ہے ـــــ مغرُور خود پسند اور خُدا فراموش!

سر سکندر حیات خاں نے گورنری کے منصبِ بلند پر فائز ہونے کے بعد بھی اپنی وضع کو نہ بدلا، جس سے جیسے تعلّقات تھے، اُن کو اِسی طرح نباہا اور "باقی رکھا!" قائم مقام گورنری کے زمانے میں اُنھوں نے اپنی رہائش اُسی کوٹھی میں رکھی، جس میں بہ حیثیت وزیرِ مال رہتے تھے۔ کوٹھی سے صبح کے وقت گورنمنٹ ہاؤس جاتے اور اپنے فرائض انجام دے کر شام کو اپنی کوٹھی واپس آجاتے۔ رات کی تقارِیب میں بعض اوقات

دیر تک گورنر ہاؤس میں رہنا ہوتا، مگر وہ اپنی کوٹھی میں آکر ہی سوتے۔

ایک دن موٹر میں بیٹھنے کے لیے کوٹھی سے باہر نکلے تو دیکھا کہ میونسپل کمیٹی کا جمعدار کھڑا ہُوا کوٹھی کے لان کو مزدوروں سے دُرست کرا رہا ہے۔ سر سکندر نے موٹر میں سوار ہونے سے قبل کُرسی اُٹھائی اور جمعدار کے پاس لاکر رکھ دی۔ کُرسی رکھتے ہوئے وہ بولے ؛ دیکھو! اِس کُرسی پر بیٹھ کر مزدوروں کی نگرانی کیا کرو۔ مرحُوم کی یہ عادت تھی کہ جب ڈرائنگ رُوم، برآمدے یا کوٹھی کے لان سے اُٹھ کر سونے کے کمرے میں جانے لگتے تو اپنا حُقّہ خُود اُٹھا کر لے جاتے، کسی نوکر کو نہ اُٹھانے دیتے۔

راقم الحروف کے بزرگوں سے اُن کے خاندانی مراسم تھے۔ چنانچہ جب میرے والد فقیر سیّد نجم الدّین کا اِنتقال ہُوا تو سر سکندر ہمارے آبائی مکان واقع بازارِ حکیماں میں تعزیت کے لیے تشریف لائے۔

سر سکندر حیات خاں مرحُوم کا سب سے بڑا کارنامہ شاہی مسجد لاہور کی مرمّت کا اِنتظام کرنا ہے۔ اِس مسجد کا فرش جگہ جگہ سے اُکھڑ گیا تھا۔ دِیواروں اور محرابوں میں دراڑیں سی دکھائی دیتی تھیں۔ بُرجیاں اور کنگرے ٹُوٹ گئے تھے۔ سر سکندر حیات نے اِس عظیم الشّان مسجد کی مرمّت کے لیے اُس کی شان و شوکت کے مطابق اپنے ذاتی اثر و کوشش سے کثیر رقم حکومت سے منظور کرائی۔ اگر خُدانخواستہ شاہی مسجد کی مرمّت کا وسیع

پیمانے پر انتظام نہ ہوتا، تو اس کی حالت بڑی زبُوں اور سقیم ہو جاتی۔ مرمت پر کئی سال تک جو لاکھوں رُوپیہ خرچ ہُوا ہے اُس نے مسجد کی شان و شکوہ کو برقرار رکھا۔ سر سکندر کو اُن کی اِس خدمت کا دنیا میں یہ صلہ مِل گیا کہ اِس پُر شکوہ مسجد کے دامن میں اُن کی آخری آرامگاہ ہے۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ اپنے دُوسرے بزرگوں اور عزیزوں کی طرح وہ بھی اپنے خاندانی قبرستان واقع واہ ضلع کیمبل پور میں دفن کیے جاتے اور اُن کی قبر گمنام ہو کر رہ جاتی۔

وُہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہُوئے اور ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے اُنھوں نے پچاس سال کی عُمر پائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اُن کی قدر و منزلت، شہرت و ناموری اور عزّت و دَولت شباب پر تھی۔ ہم دُنیا والے ایسے موقعوں پر کہہ اُٹھتے ہیں کہ جانے والے کے ابھی مرنے کے دِن نہ تھے۔ بے وقت موت آئی۔ مگر یہ ہماری خام خیالیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر جان دار کی زندگی اور مَوت کا وقت لکھ دِیا گیا ہے، جس میں ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر و تعجیل نہیں ہوتی، قدُرت کے کام ہمارے اندازوں اور آرزُوں کے مُطابق نہیں چلتے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو گھڑی بھر میں دُنیا کا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

اُن کی اچانک مَوت کے بعد یہ دلچسپ واقعہ سُننے میں آیا کہ انھیں زندگی میں شبِ قدر ہُوئی اور دُوسری مرتبہ اس کی جھلک انھیں ایک خواب میں بھی

دِکھائی دی —— حال ہی میں مرحُوم کے نامُور فرزند سردار شوکت حیات خاں سے مُلاقات ہُوئی تو اُنھوں نے بھی میرے دریافت کرنے پر انھیں روایات کو دُہرایا، بلکہ ان کی توثیق و تصدیق کر دی ۔ یہ واقعات اِس طرح ہیں ——

ایک بار سکندر حیات اپنے بڑے بھائی نواب اسلم حیات کے مکان واقع کُوپر روڈ پر مقیم تھے کہ ۲۷ رمَضانُ المُبارک کو شب میں عَین اُس وقت جب موصُوف قرآنِ کریم کی تلاوَت کر رہے تھے؛ سامنے سے ایک روشنی نمُودار ہُوئی اور آناً فاناً چاروں طرف پھیل کر ساری فضا کو بُقعۂ نُور بنا دِیا ۔ ایسا منظر اُنھوں نے کبھی دیکھا تھا نہ سُنا تھا ۔ مرحُوم پر ایک خاص کیفیت طاری ہُوئی اور فوراً سربسجُود ہو گئے اور اللہ تعالےٰ سے فضل و کرم کے طالب ہُوئے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مَیں نے اُس وقت جتنی بھی دُعائیں مانگیں، سب کی سب اپنی زندگی ہی میں پُوری ہوتی دیکھ لیں ۔ اِنتقال سے تین مہینے پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک خُوشنما گھڑی میں ایک، دو، تین کے ہندسے اُبھر رہے ہیں ۔ بستر سے اُٹھ کر باہر صحن میں آئے تو آسمان کی فضا میں بھی ایسا ہی دائرہ نظر آیا ۔ وہ اسی جگہ کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہنے لگے؛ گھر کے سب لوگو! اُٹھو اور اللہ تعالےٰ کے حضُور سجدے میں گر جاؤ کہ قبولیّتِ دُعا کا وقت آن پہنچا ہے ۔

اُن کی زندگی کا یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ رمَضانُ المُبارک کا

چاند نظر آتا تو اُس وقت گھر کے مُلازمین کو بُلا کر کہتے کہ دیکھو، گیارہ مہینے تم نے پکا کر ہمیں کھلایا ہے، اب کل سے ہم پکائیں گے اور تم لوگ کھاؤ گے اُس وقت سے عید کا چاند ہونے تک روزہ دار مُلازمین کو کھانا نہ پکانے دیتے بلکہ خُود پکاتے اور نوکروں کو بھی کھلاتے۔ مرحُوم کو خود کھانا پکانے کا شوق تھا اور مشّاق رکاب دار کی طرح کھانا پکاتے تھے۔ روزے پابندی کے ساتھ رکھتے اور پُورے مہینۂ رَمَضان کے احترام کا حتیّٰ الامکان اہتمام کرتے۔

اپنے صاحبزادوں کے ولیمے کے موقع پر افسرانِ عمائدینِ شہر، رُؤَسائے پنجاب اور عزیز اقربا کی مہمان نوازی میں مصرُوف رہے۔ رات کے وقت جب سونے کے لیے جانے لگے تو حسبِ معمُول حُقّہ اُٹھا کر چلے۔ بیوی سے کہا کہ سینے میں کچھ جلن سی محسُوس ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کباب کھانے سے ہو گئی ہے۔ سوڈا پی لُوں تو ٹھیک ہو جائے گی۔ سوڈا آیا۔ اُسے پیا اور اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ بیوی نے بھی قریب ہی بیٹھ کر کچھ باتیں کیں، لیکن کوئی جواب نہ پا کر اُن کی طرف دیکھا۔ پھر اضطراب کے عالَم میں اُن کا شانہ ہلایا، لیکن اِس عرصے میں وُہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

بیوی نے چیخ ماری۔ اِس چیخ کو سُن کر گھر کے سارے افراد اِس کمرے میں جمع ہو گئے، جہاں سر سکندر حیات موت کی نیند سو رہے

تھے۔ آنِ واحد میں سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی اور عمائدینِ شہر، عزیز، احباب، سرکاری عُہدیداران دو گھڑی پہلے، جس شامیانے میں ولیمے کی پُر تکلّف دعوت کھا کر مُبارک باد دے رہے تھے، ٹھیک اُسی جگہ اُنھی کُرسیوں اور اُسی شامیانے کے نیچے مَوت کا پُرسا دے رہے تھے ! یہ دُنیا ہے ـــــ تلك الايام نداولها بين النّاس۔

یہ تھا پنجاب میں دورِ سکندری کا آخری دِن !

سر میاں محمدؐ شفیع

باغبان پورہ کے مُعزّز و مشہُور خانوادے کے چشم و چراغ ــــــ پنجاب کی قابلِ ذکر شخصیّت اور ناموَر ہستی ــــــ وکالت میں بڑا نام پیدا کیا۔ غالباً اسی شہرت و ناموری اور قابلیّت کے سبب برطانوی سرکار کی نگاہِ انتخاب اُن پر پڑی اور وائسرائے کونسل کی ممبری کا عہدۂ جلیلہ اُنھیں تفوِیض کیا گیا۔ یہ اُس دور کا ذکر ہے جب کہ ضلع کی ڈپٹی کمِشنری ایک ہندوستانی کے لیے ترقّی کی معراج سمجھی جاتی تھی۔

میاں صاحب مرحُوم غریبوں کے بڑے غم خوار اور ہمدرد تھے ایک بار نواب گورمانی تانگے میں کہیں جا رہے تھے۔ ایک جگہ وُہ اُترے اور تانگے والے سے کہا کہ مَیں تھوڑی دیر میں آتا ہُوں۔ تم اُس وقت تک رُکے رہنا۔ تانگے والے نے عرض کیا کہ حضُور! آپ بارہ بجے سے پہلے پہلے مجھے ضرُور چھوڑ دیں۔ مَیں دوپہر کا کھانا میاں محمدؐ شفیع کے یہاں

کھاتا ہوں ۔ تانگے والا اور سر میاں محمّد شفیع کے یہاں کھانا ۔۔۔۔۔۔ !
نوّاب صاحب کو بڑی حیرت ہوئی، دریافت کرنے پر تانگے والے نے بتایا کہ میاں صاحب کے یہاں روزانہ غریبوں کے لیے کھانا پکتا ہے اور ہر اہلِ حاجت وہاں کسی روک ٹوک کے بغیر کھانا کھا سکتا ہے۔ مجھ جیسے نہ جانے کتنے ہیں جو میاں صاحب کے یہاں کھانا کھا کر اُنھیں دُعائیں دیتے ہیں۔

برسوں سے میاں صاحب کے یہاں لنگر جاری تھا مگر اس خاموشی کے ساتھ کہ دوستوں تک کو اس کی خبر نہ تھی۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خیر و نیکی کے مُعاملے میں وُہ کس قدر بے نفس تھے۔ نمُود و نمائش سے کوسوں دُور۔ قرآنِ کریم کا ایک جیبی نسخہ ہمیشہ اُن کے ساتھ رہتا تھا۔

وائسرائے کونسل کی ممبری سے سبکدوش ہو کر جب میاں محمّد شفیع لاہور واپس آئے ہیں تو اُن دِنوں غازی علم الدّین شہید اور رُسوائے زمانہ کتاب کے مصنّف راج پال کا مقدّمہ چل رہا تھا۔ اُس زمانے کے بہُت سے واقعات لوحِ قلب پر اس طرح نقش ہیں جیسے یہ سب کچھ کل ہی گزرا ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، اُن دنوں یہ بات بہُت مشہُور ہُوئی کہ جب ہائی کورٹ میں اِس مقدّمے کی سماعت شرُوع ہُوئی ۔۔۔۔۔۔
تو میاں محمّد شفیع نے ایک ممتاز قانون داں کی حیثیت سے بحث میں حصّہ

لیتے ہوئے ناموسِ رسالتؐ کے مقدّس موضوع پر اِس قدر شاندار اور معرکہ آراء تقریر کی کہ سُننے والے وارفتہ ہو کر رہ گئے ____ میاں محمدؐ شفیع کا قلب رسُولؐ اللہ کی عظمت بیان کرتے ہُوئے اِس قدر گداز ہو گیا کہ وہ عدالت میں اپنے آنسُو روک نہ سکے اور اس اثر انگیز صُورتِ حال کے باعث عدالت بھی چند لمحے تک سماعت جاری نہ رکھ سکی۔

جب عدالتِ عالیہ نے ماتحت عدالت کے "سزائے موت" کے فیصلے کو بحال رکھا اور غازی علم الدین کو میانوالی جیل میں پھانسی دے دی گئی تو حُکّام نے سرکاری نگرانی میں نعش کو بڑی عجلت کے ساتھ دفن کرا دیا۔ مُسلمانوں کو اِس واقعے کا عِلم ہُوا تو اُنھوں نے سخت احتجاج کیا اور غازی علم الدّین کا جسدِ خاکی حاصل کرنے کے لیے بڑا جوش دکھایا۔ یہ موقع بڑا اہم اور نازک تھا، اور فضا میں بڑی کشیدگی تھی۔ میاں محمدؐ شفیع گورنرِ پنجاب سے خود جا کر ملے اور حُسنِ تدبیر سے کام لے کر اُنھیں نعش دینے پر آمادہ کر لیا۔

میاں صاحب کی اِس کوشش کی بدولت پنجاب میں حکُومت اور مُسلمانوں کے درمیان ایک بہت بڑے تصادم کا خطرہ ٹل گیا ____

میانوالی جیل سے نعش پہچان کر لاہور لانے کے لیے جن تین اصحاب کے نام حکُومت نے منظور کیے تھے، اُن میں ایک بزرگ سیّد شجاعت علی

حسنی، گورنر اسٹیٹ بنک پاکستان، کے والد سید مراتب علی بھی تھے، جو اُن دنوں لاہور میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ مرحوم نے یہ واقعہ راقم الحروف کو سُنایا کہ جس وقت غازی علمُ الدین کی نعش قبر سے کھود کر نکالی گئی تو اتنے دن گزرنے کے باوجود نعش تر و تازہ نکلی جیسے کہ ابھی ابھی سپردِ خاک کی گئی ہے۔ اسے معجزہ سمجھیے یا شہادت کا حسنِ کرامت! بہرحال یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ اس صحیح سلامت نعش کو لاہور لایا گیا اور جب مقررہ تاریخ پر جنازہ اُٹھا ہے تو کاندھا دینے والوں کی تعداد بے اندازہ تھی۔ کم از کم لاہور کی تاریخ میں ایسے ہجوم کی مثال نہیں ملتی۔ تجہیز و تکفین کا سارا انتظام میاں محمد شفیع کے ہاتھ میں تھا۔ اُن کی نگرانی میں جنازہ قبرستان پہنچا اور لاکھوں مسلمانوں نے شہید کی قبر کو مٹّی دی۔ میاں صاحب شہید کے جنازے میں یُوں نظر آرہے تھے جیسے کسی دُولھا کی بارات کو بڑی سج دھج سے لے جا رہے ہیں۔

مَیں اکثر اوقات یہ سوچ کر حیران ہو جاتا ہُوں کہ ایک بڑھئی کا لڑکا، جس کی عُمر ۲۲، ۲۳ سال کی ہو گی، ناموسِ رسُولؐ پر قربان ہو کر دُنیا میں اس قدر عزّت پاتا ہے کہ بادشاہوں کو بھی مرنے کے بعد یہ تکریم و اعزاز نصیب نہیں ہوتا۔ پھر آخرت میں اُس کے اعزاز کی کیفیت کیا ہو گی ــــــ!

کیا یہ قابلِ رشک سعادت یعنی ناموسِ رسالتؐ کے لیے

شہادت ہر کسی کے نصیب میں ہو سکتی ہے ؟

اہلِ دانش کے پاس تو اس سوال کا صرف یہی جواب ہے ؎

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مُدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مرزا سلطان احمدؒ

میرے بزرگوں سے ان کے دوستانہ مراسم اور قریبی روابط تھے۔ اُس زمانے میں ہوٹل موجود ہی نہ تھے۔ نہ آج کی طرح عالی شان ہوٹل تعمیر کرنے یا اُن میں قیام کرنے کا تصوّر تھا۔ مہمان آتے اور اپنے قریبی اقارب و احباب کے پاس ٹھہرتے۔ عام لوگوں کے لیے سرائیں تھیں۔ دوست دوستوں کے یہاں آتے اور بلاتکلّف قیام کرتے۔ مہمان نوازی شرافت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ مہمان سے لوگ اُکتاتے نہ تھے، بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ مہمان کا آنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا باعث ہوتا ہے اور مہمان غیب سے اپنا رِزق خود لے کر آتا ہے۔ میزبانی اور مہمانی کی وجہ سے آپس کے تعلّقات کی بھی تجدید ہوتی رہتی۔

مرزا صاحب اعلیٰ سرکاری عُہدوں پر فائز رہے۔ ادھر میرے اکثر بزرگ بھی مُختلف سرکاری محکموں سے وابستہ رہے۔ انگریز نے کچھ

ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ خوشحال گھرانوں کے لوگ بھی جب تک کسی سرکاری عُہدے اور دفتری منصب پر فائز نہ ہوتے، زیادہ باوقار نہ سمجھے جاتے تھے۔ سرکاری ملازمت نشانِ عزت تھی۔ مرزا صاحب اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر بڑا عبور رکھتے تھے، مگر انگریزی نہیں جانتے تھے۔

سرکاری ملازمت میں اُنھوں نے اپنے فرائض بڑی محنت، ذہانت اور دیانت داری سے انجام دیے۔ جس جگہ بھی رہے، نیک نام رہے۔ بالادست افسر بھی خوش، ماتحت عملہ اور اہلِ معاملہ عوام بھی مطمئن۔ وہ اپنی اِن خوبیوں کے سہارے ترقّی کرتے کرتے ڈپٹی کمشنر کے عہدے تک پہنچے جو اُس زمانے میں ایک ہندوستانی کی معراج تھی۔ سادہ لباس، سادہ طبیعت۔ انکسار اور مروّت اُن کے مزاج کا خاصہ تھا۔ اُن کی ذات کے جوہر اُس وقت پُوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آئے، جب وہ ریاست بہاول پور کے وزیر بنا کر بھیجے گئے۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی مُلازمین سے کہا ـــــ

"سُلطان احمدؔ اِس ٹھاٹھ باٹھ اور ساز و سامان کا
عادی نہیں ہے۔"

چُنانچہ اُن کے کہنے سے تمام اعلیٰ قِسم کا فرنیچر اور ساز و سامان اکٹھا کر کے ایک کمرے میں مقفّل کر دِیا گیا۔ اُنھوں نے رہنے کے لیے صرف ایک کمرہ منتخب کیا۔ نمائش اور دکھاوا تو اُنھیں آتا ہی نہ تھا۔ لباس اور

رہائش کی طرح کھانا بھی سادہ کھاتے ۔

جب ملازمت سے اُن کے سبکدوش (ریٹائر) ہونے کا وقت آیا تو انھی دِنوں پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد حکومت کے خلاف ترکِ موالات (نان کوآپریشن) کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ پہلے لاہور اور پھر گوجرانوالہ اِن ہنگاموں کی لپیٹ میں آگیا۔ مرزا سُلطان احمد گوجرانوالہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہاں سب سے زیادہ ہنگامے ہُوئے۔ عوام کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ لیڈروں کی ہدایات کے برخلاف اُنھوں نے آئینی حدود کو توڑ دِیا۔ بعض سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا اور ریلوے اسٹیشن تو پُورے کا پُورا جلا دِیا۔ ایک جمِّ غفیر ہاتھوں میں بانس، لاٹھیاں اور اینٹ پتھّر لیے ہُوئے ضلع کچہری کی طرف بڑھا۔ مرزا سلطان احمد ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ اگر اپنے تدبّر اور خوش بیانی سے کام نہ لیتے تو یہ مُشتعل لوگ نہ جانے کیا کر کے دم لیتے۔ مرزا صاحب نے اُس پُرجوش ہجُوم کے سامنے ایسی سُلجھی ہُوئی تقریر کی کہ نفرت و غُصّہ کی یہ آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ وُہی جلوس مرزا سلطان احمد کی سرکردگی میں شہر کو واپس ہوا اور جن کی زبانوں پر "انگریز مُردہ باد" کے نعرے تھے، وہ اب "مرزا سُلطان احمد زندہ باد" کے جیکارے لگانے لگے ۔

ترکِ موالات کے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے تو گورنرِ پنجاب نے ایک ملاقات میں مرزا سلطان احمد سے کہا کہ آپ گوجرانوالہ کا اِنتظام ٹھیک

طور پر نہ کر سکے۔ مرزا صاحب اس کے جواب میں بولے کہ لاہور میں تو "یوٗر ایکسی لینسی" بہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ پھر بھی یہاں کے ہنگاموں کو نہ روک سکے۔ آپ یہاں رہ کتے تو یہ ہنگامے وہاں نہ پہنچتے۔ مرزا صاحب کے اس جرأت مندانہ معقول جواب پر لاٹ صاحب خفیف ہو کر رہ گئے۔

انگریز حکومت نے جب پنجاب میں مارشل لاء نافذ کیا ہے تو وہ بڑی سختی اور شدید آزمائش کا زمانہ تھا۔ امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ اور حافظ آباد کے باشندوں پر سب سے زیادہ سختی کی گئی۔ میں اُس زمانے میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بڑے تشدّد اور جبر و استبداد کا دور تھا۔ برطانوی ملوکیت چنگیزیت پر اُتر آئی تھی۔ ہر روز ایک سے ایک زیادہ سخت حکم نافذ ہوتا۔ شہری آزادی برطانوی سامراج کے شکنجے میں کسی جا رہی تھی۔ حکم دیا گیا کہ شہر کی تمام موٹر کاریں ہیڈ کوارٹر میں جمع کرا دی جائیں۔ اُس وقت لاہور میں مشکل سے پچاس ساٹھ کاریں ہوں گی۔ پھر حکم ہوا کہ موٹر سائیکلیں بھی ہیڈ کوارٹر میں پہنچا دی جائیں۔ اس کی بھی لوگوں کو جبراً قہراً تعمیل کرتے ہی بنی، مگر جور و ستم کا یہ سلسلہ اس حد پر بھی نہ رُک سکا ایک اور فرمان صادر ہوا، جس کی تعمیل میں سائیکلیں تک سرکاری تحویل میں دے دینی پڑیں۔ حکم یہ تھا کہ سائیکلیں پمپ اور لیمپ سمیت جمع کرائی جائیں جن بے چاروں کے پاس لیمپ اور پمپ نہ تھے۔ اُنھوں نے بازار سے مول لے کر سرکاری حکم کی تعمیل کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مارشل لاءُ

کی تلوار ہر کسی کے سر پر لٹک رہی ہے۔ راقم الحروف کے پاس بھی ایک سائیکل تھی۔ جو کئی سال کی رفاقت کے سبب مجھے بہت عزیز تھی۔ میں اسے مع ساز و سامان دل پر جبر کر کے ایمپائر[1] سینما کے مرکز میں داخل کر آیا۔ کیا کرتا، حکمِ حاکم، مرگِ مفاجات!

والدِ مرحوم اُس زمانے میں حافظ آباد میں تعینات تھے، جو فسادات اور ہنگاموں کے اعتبار سے کافی متاثرّ علاقہ تھا اور انگریز کی خاص توجّہ کا مرکز بن گیا تھا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر نے اُن سے دریافت کیا؛ "آپ کے خیال میں مارشل لاء کو کتنی مدّت تک اور قائم رکھنا چاہیے؟"

والدِ مرحوم نے دست بستہ عرض کیا؛ "صاحب! بہت ہو چکا ہے۔ اب بس کر دو۔"

اُن کے اِس فقرے میں نہ جانے کتنے مظلوموں کی فریاد و فغاں شامل تھی۔ ڈپٹی کمشنر اِس فقرے کو سُن کر ایک دم سنجیدہ (Serious) ہو کر خاموش ہو گیا۔ اُس کی اِس خاموشی کا راز اُس وقت کھلا، جب ایک ہفتے کے اندر اندر والد صاحب کا تبادلہ دُوسرے علاقے میں کر دیا گیا۔ اِس واقعے سے اندازہ ہُوا کہ ہر سچّی بات کچھ نہ کچھ قربانی

---

[1] لاہور میں صرف یہی ایک سینما ہال تھا، جس میں انگریزی کی خاموش فلمیں دِکھائی جاتی تھیں۔

چاہتی ہے۔

جوانی کی کوتاہ نظری کے سبب میں نے والدہ صاحبہ کی خدمت میں عرض کیا کہ والد صاحب کو ڈپٹی کمشنر سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اِس طرح خواہ مخواہ انگریز بالادست افسر کی ناراضی مول لی۔ لیکن آج میں اپنی اِس خام خیالی پر ندامت محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اس نہج و انداز پر کیوں سوچا؟ کیونکہ اُنھوں نے تو یہ کہہ کر لگلے جہان میں حاکمِ مطلق اور منصفِ حقیقی کے سامنے سُرخرو ہونے کا ایک سبب پیدا کیا اور یہ مشورہ دیتے ہوئے ذاتی مفاد اور وقتی مصلحتوں کے لیے سچائی اور ایمان کا دامن نہیں چھوڑا۔

یہاں انگریز کے اس کردار کو سراہنا بھی ضروری ہے کہ اِس اختلاف رائے کے باوجود ایک جگہ سے دُوسری جگہ تبادلے ہی کو کافی تنبیہ سمجھا گیا۔ اِس سے زیادہ اور کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔

مارشل لاء جب ختم ہُوا تو انگریز سرکار نے اِس "لاقانونی دور" کے واقعات کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی، جس کے صدر مسٹر ہنٹر قرار پائے۔ عوام کی طرف سے ممتاز قومی نمائندے گواہ کی حیثیت سے ہنٹر کمیٹی کے سامنے پیش ہُوئے۔ مرزا سُلطان احمد صاحب نے جس صاف گوئی، بے باکی اور اخلاقی جُرأت کے ساتھ اِس کمیٹی کے رُوبرُو گواہی دی اور واقعات کا تجزیہ کیا وہ "ہنٹر کمیٹی" کی رپورٹ

میں زرّیں ورق کی صُورت میں محفُوظ رہے گا۔

مرزا سُلطان احمد پر فالج کا حملہ جان لیوا ثابت ہُوا۔ علاج معالجے کے لیے انھیں لاہور لایا گیا۔ راقم الحرُوف کے ایک بزرگ سیّد اصغر علی شاہ کے ہاں اُن کا قیام رہا۔ یہ مکان ہمارے مکان سے ملحق تھا۔ میں اکثر مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ اپنے خطوں کے جوابات وُہ مُجھ سے لکھواتے۔ میرے لیے بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ مرزا صاحب بیمار ہونے کے باوجُود روانی کے ساتھ خط کی عبارت فرفر بولتے اور میں اپنی بدخطی چھپانے کے لیے آہستہ لکھتا۔ میری سُست نگاری، اُن کی زُود گوئی کا ساتھ کہاں دے سکتی تھی۔ جب میں خط لکھ چکتا تو مرزا صاحب اُسے پڑھتے اور میں اُن کے تیوَروں سے بھانپ لیتا کہ میری تحریر سے وہ مطمئن نہیں ہیں بلکہ کچھ دل گرفتہ ہی ہیں۔ میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا۔ مجھے اُن کا ایک جُملہ جو اُنھوں نے اپنے دوست کے خط میں مجھ سے لکھوایا تھا، آج تک یاد ہے ــــــ

"یہ خط وہ شخص کسی اور سے لکھوانے کا محتاج ہے، جو جب بھی قلم اُٹھاتا تھا تو صفحے کے صفحے بے تکان لکھتا چلا جاتا اور پھر بھی اُس کا قلم رُکنے کا نام نہ لیتا"۔

اِس بیماری سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ چند دن کے لیے طبیعت

بحال بھی ہُوئی تو وہ موت کا سنبھالا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ بڑے صاحب کردار بزرگ تھے۔

نوّاب محمدؐ اسحٰق خاں

یہ اب سے تقریباً پچاس سال پہلے کی بات ہے، جب متّحدہ ہندوستان کے زمین و آسمان ہی کچھ اور تھے اور —— شرافت، دین داری، غیرت اور وضع داری —— مسلمانوں کی سوسائٹی کے عناصرِ اربعہ تھے۔ اُنھی دِنوں میں علی گڑھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ نوّاب محمدؐ اِسحٰق خاں ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ کے ٹرسٹی تھے۔ نوّاب صاحب اپنی شرافتِ نفس اور دیانت کے علاوہ اور بہت سی خُوبیوں کے سبب ہر کہیں بڑی عزّت اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُن کا حُلیہ اب تک نگاہوں میں پھر رہا ہے —— فربہ جسم، سُرخ و سپید رنگت، سفید ڈاڑھی، جس نے اُن کی شخصیت کو بارُعب اور وجیہہ بنادِیا تھا۔ اُن کی صُورت دیکھ کر ہر کِسی کے دِل میں تعظیم و اِحترام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا —— غالباً اُن کا یہ عُہدہ اعزازی تھا، مگر تنخواہ یاب

عہدیداروں سے بڑھ کر اس علمی ادارے کی ترقی اور بہتری کا خیال رکھتے۔
اور اسی جد و جہد میں لگے رہتے۔ اُن کا محبوب ترین مشغلہ یہ تھا کہ سارے
دن کالج اور اسکول کا چکّر لگاتے اور ایک ایک شعبے کی نگرانی کرتے۔
علی گڑھ کالج سے جو اسکول متعلق تھا، اُس میں طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ
تھی کہ ایک چھوڑ پانچ بورڈنگ ہاؤس بھی اس تعداد کے لیے کافی نہ تھے
میکڈانل ہاؤس، ممتاز ہاؤس، ماریسن کورٹ، ظہور وارڈ اور انگلش
ہاؤس، اِن میں ہر بورڈنگ ہاؤس کے لیے علیٰحدہ ڈائیننگ ہال تھا۔
نواب صاحب کھانے کے وقت بہ طورِ خاص راؤنڈ لگاتے اور طلبہ کے
کھانے کو چکھ کر دیکھتے کہ بچّوں کو کس قسم کا کھانا دِیا جا رہا ہے۔

اساتذہ طلبہ کو کس انداز میں درس دیتے ہیں اور تعلیم کے ساتھ
ساتھ تربیت کا کیا عالم ہے۔ بچّوں کے مشاغل اور اُن کے آداب و
اَخلاق کا کیا رنگ ڈھنگ ہے — نواب صاحب اِن تمام باتوں پر
نگاہ رکھتے — تعلیم و تربیت کے کیا تقاضے ہیں اور نئی نسل کی ذہنی
نشو و نما کن خطوط پر ہونی چاہیے، نواب صاحب کو اِس کا صرف اندازہ
نہیں، تجربہ بھی تھا۔

سر سیّد احمد خاں مرحوم نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں
پر جو عظیم احسان کیا ہے، وہ کسی تشریح و ثبوت کا محتاج نہیں ہے
یہ بھی سر سیّد کے اخلاص کا ثمرہ اور اُن کی نیک نیّتی کا ظہور تھا کہ اُن

کے بعد اِس ادارے کو جن حضرات کی سرپرستی میسّر آئی، وُہ بڑے مخلص اور فرض شناس تھے۔ نوّاب مُحسن المُلک اور نوّاب وقارالملک کی خدمات سب پر روشن ہیں۔ اِن کے ساتھ یا اِن کے بعد نوّاب اسحٰق خاں کا ہی نام آتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نوّاب صاحب کو اگر کسی طالبعلم کی بیماری کی خبر مل جاتی تو وہ اُس کی عیادت فرماتے اور اُس کے علاج معالجے کے بارے میں پُوچھتے رہتے۔

راقم الحرُوف کو یاد ہے کہ جس سال علی گڑھ اسکُول میں میرا داخلہ ہُوا ہے، اُسی سال نوّاب میر عُثمان علی خاں، نظامِ حیدر آباد، وائسرائے ہند سے مِلنے کے لیے دہلی تشریف لائے۔ اُن کی جوانی کا عالم تھا۔ غالباً میر محبُوب علی خان نے انھی دنوں وفات پائی تھی اور یہ تخت نشین ہُوئے تھے۔ نوّاب اسحٰق خاں کو جب نظامِ دکن، میر عثمان علی خاں، آصف جاہ سابع کے دہلی آنے کا عِلم ہُوا تو وہ ایک وفد لے کر وہاں پہنچے اور فرماں روائے دکن سے علی گڑھ تشریف لانے کی درخواست کی۔ آج جمہوریت کے نعروں اور تذکروں نے امارت و دولت کی قدروں کو بہت کُچھ بدل دیا ہے، مگر اُس زمانے میں ریاستوں کے راجاؤں اور نوّابوں کی شان وشوکت اور قدر ومنزلت کا یہ عالم تھا کہ اُن کا کہیں جانا غیر معمُولی واقعہ اور اعزاز کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ جس علاقے سے کسی والیِ ملک کی اسپیشل ٹرین گزرتی، اسٹیشنوں پر

تماشائیوں کے ٹھٹ لگ جاتے اور ہفتوں تک چوپالوں اور بیٹھکوں میں یہی گفتگو موضُوعِ بحث رہتی ۔

نوّاب اسحٰق خاں جس وفد کو لے کر دِلّی گئے تھے، وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ نظامِ دکن نے علی گڑھ آنا قبُول کر لیا۔ آمد کی تاریخ اور پروگرام بھی طے ہو گیا۔ طلباء کو اِس کی اِطّلاع ملی تو اُنھیں اِتنی خوشی ہُوئی جیسے آج ہی عِید کا چاند ہُوا ہے۔ پھر چار دِن کی تعطِیل کے اعلان نے اُن کی خوشی کو اور دوبالا کر دِیا۔ کالج سجایا جانے لگا۔ خیر مقدم کے شاہانہ اِنتظامات ہونے لگے۔ طلباء اور اساتذہ سب کے سب اِسی میں مصرُوف تھے۔ ہمارے اردُو کے اُستاد جو اِن اِنتظامات میں ہمہ تن محو تھے۔ اُنھوں نے ایک شعر مجھے سنایا جو اِس واقعے کے ساتھ کبھی کبھار یاد آجاتا ہے۔ شعر یہ تھا ——

بہرِ گل گشت چمَن میں جو نظام آتے ہیں
اُنگلیاں سرو اُٹھاتے ہیں کہ وُہ آتے ہیں

قافیے اور ردِیف کا اِن دونوں مصرعوں میں کیا انداز ہے، یہ نزاکتیں تو اربابِ فن ہی جان سکتے ہیں۔ مجُھے تو موقع کی مناسبت سے یہ شعر اپنی طالب علمی کے زمانے میں بہُت پسند آیا۔

اسٹریچی ہال میں نظام حیدرآباد کو سپاس نامہ دِیا جانے والا تھا۔ کالج اور اِسکوُل کے تمام طلباء سلیقے کے ساتھ قطار اندر قطار

محوِ انتظار اور چشم براہ تھے بلکہ یُوں کہیے کہ دیدہ و دل کو فرشِ راہ کیے ہُوئے تھے۔ حضورِ نظام تشریف لائے تو سب لوگ ہمہ تن دید اور مجسّم نگاہ بن گئے۔ تاجدارِ دکن کے سرو قامت پر کالج یونیفارم کتنی بھلی لگتی تھی۔ سیاہ شیروانی، تنگ موری کا سفید پائجامہ، سُرخ رنگ کی ترکی ٹوپی۔ اِس لباس میں نہ کوئی اِمتیازی شان تھی اور نہ شاہانہ آرائش و زیبائش کی کوئی جھلک پائی جاتی تھی۔ البتّہ اُن کے پیچھے پیچھے ایک درجن کے قریب جو اسٹاف کے لوگ چل رہے تھے، وُہ حیدرآبادی لباس پہنے تھے۔ ہمرو اور جامہ دار کی جاذبِ نظر شیروانیاں، سروں پر دستار اور کمر سے زرّیں پیٹیاں بندھی ہُوئی۔ دو کمسن شہزادے بھی جلو میں تھے۔

طلبائے کالج اِسٹاف اور دُوسرے معزّزین نے خیر مقدم میں بڑی گرم جوشی کا مُظاہرہ کیا۔ جب تک نظامِ دکن کُرسیِ صدارت پر رونق افروز نہ ہوگئے، تقریباً دس پندرہ منٹ تک ہال تالیوں سے گُونجتا رہا۔ اسٹریچی ہال کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ شان دار ڈائس شاہانہ طرز کی بلند کُرسی پر نظام حیدرآباد تشریف فرما تھے۔ اُن کی بائیں طرف کُرسی پر نوّاب اسحاق خاں بیٹھے تھے۔ اِن کُرسیوں کے پیچھے نظام کے مصاحب اور اسٹاف کے لوگ دست بستہ کھڑے تھے۔ تعظیم واِحترام اور قدر و منزلت کا ایسا منظر بس پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

نوّاب اسحٰق خاں مرحُوم نے تلاوتِ قرآنِ مجید سے جلسے کا آغاز کیا

پھر کالج کے نمائندے کی حیثیت سے سپاس نامہ پڑھا۔ میر عثمان علی والیِ دکن نے سپاس نامے کے جواب میں مختصر مگر جامع و دل پذیر تقریر کی۔ یہ جُملہ اسٹریچی ہال پر نگاہ ڈالتے ہُوئے خاص انداز میں فرمایا ـــــ

"آپ نے بہت تکلّفات سے کام لیا ہے۔"

نظامِ دکن جن کے نام کے ساتھ اعلیٰ حضرت لکھا جاتا تھا۔ جب تقریر ختم کر چکے تو نوّاب اسحٰق خاں کی طرف اشارہ کیا۔ وُہ اپنی کُرسی سے اُٹھے اور نظام نے اُن کے کان میں کُچھ کہا۔ ہم سب طلباء اِس منظر کو بڑی دل چسپی سے دیکھ رہے تھے اور کُچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا سرگوشی ہو رہی ہے۔ نواب صاحب بڑے ہی سنجیدہ اور سن رسیدہ بزرگ تھے۔ مگر والیِ دکن کی بات سُن کر بچوّں کی طرح فرطِ خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ لوگ حیران تھے کہ حضور نظام نے آخر ایسی کیا بات کہی جسے سُن کر نواب صاحب تالیاں بجانے پر مجبُور ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک مجمع پر حیرت و اِنتظار کی کیفیّت طاری رہی۔ پھر نوّاب صاحب نے اعلان کیا کہ حضُور نظام نے کالج کو اَسّی ہزار رُوپے کا عطیہ دِیا ہے تاکہ طلباء کی رہائش کی جو کچّی بارکیں ہیں، اُن کی جگہ پُختہ عمارت بنا دی جائے۔ اِس کے بعد کہا کہ حضُورِ نظام نے مزِید امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔ اِس اعلان کو سُن کر اسٹریچی ہال میں پھر تالیاں گُونجیں اور تالیاں بند ہونے کے بعد بھی کُچھ دیر تک صدائے بازگشت آتی رہی۔

یہ تقریب ختم ہوئی تھی کہ نماز کا وقت ہوگیا۔ ہال کے قریب ہی مسجد تھی۔ نظام حیدر آباد نے مسجد میں جاکر باجماعت نماز ادا کی۔ اِس کے بعد طلباء، اساتذہ اور دُوسرے معزّزین نے اُنھیں پُرخلوص و باوقار انداز میں الوداع کہا۔

نوّاب اِسحٰق خاں کی زندگی کے اِس مختصر سے خاکے میں یہ دِکھانا اور بتانا مقصُود ہے کہ مرحُوم خود کو قوم کا خادم سمجھ کر اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ سر سیّد احمد خاں کے لگائے ہُوئے پَودے کو سچ مُچ اپنے خُونِ جگر سے سینچا اور اُسے ثمر دار بنایا۔ پھر اِخلاص و بے نفسی کا یہ عالم کہ

کام چھوڑا ہے مگر نام نہیں چھوڑا ہے

نوّاب اسحٰق خاں میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد نوّاب مُصطفٰے خاں شیفتہ مغلیہ حکُومت کے دورِ آخر کے معزّز اُمراء اور عمائد میں شمار کیے جاتے تھے۔ جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر میں اُن کا قلعہ آج تک موجُود ہے۔ اُسی نواح میں اُن کی جاگیر تھی۔ نوّاب مُصطفٰے خاں شیفتہ بلند پایہ شاعر اور دِیدہ وَر نقّاد تھے۔ مولٰینا الطاف حسین حاؔلی پانی پتی اُن کے بچوّں کے اتالیق تھے۔

نوّاب اسحٰق خاں کے فرزند نوّاب محمّد اِسماعیل خاں نے تحریکِ خلافت سے لے کر مُسلم لیگ کے آخری دور تک قوم کی خدمات انجام دیں۔ قومی خدمات کی مصروفیت کے سبب اُنھیں بیرسٹری کرنے کا بھی

موقع نہ مل سکا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی وائس چانسلری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو کر اُنھوں نے بڑے خلوص اور انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا۔

نوّاب اسحٰق خاں کے ایک نہیں، اللہ کے فضل سے تین پوتے ــــ مسٹر مدنی، مسٹر آئی۔اے خان اور مسٹر عدنی ــــ پاکستان میں سی ایس پی ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

نوّاب صاحب مرحوم جیسے مخلص اور دردمند منتظم ہمارے موجودہ تعلیمی اداروں کو میسّر آجائیں تو ہمارے تعلیمی نظام کی بہُت سی خرابیاں اور کوتاہیاں دُور ہو سکتی ہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ بعض لوگوں نے اسکولوں اور کالجوں کو ذریعۂ تجارت بنا رکھا ہے۔

نوّاب محمدؐ اسحٰق خاں کی زندگی کے یہ سبق آموز حالات، تعلیم کو تجارت کا ذریعہ اور کمائی کا وسیلہ بنانے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔
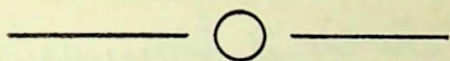
مولٰینا صلاحُ الدّین احمدؒ

مولٰینا صلاحُ الدین احمد مُدیرِ اعلیٰ" مجلّۂ "ادبی دُنیا" (لاہور) نے اُردو زبان و ادب کی ترقّی و ترویج کے لیے اپنی زندگی تج دی۔ اُردو رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط اِختیار کرنے کا شگوفہ جب پاکستان میں چھوڑا گیا تو مولٰینا مرحوم نے اِنتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ اِس تجویز کی مُخالفت کی۔ اُنھوں نے اُردو زبان و ادب کے لیے پاکستان میں سچ مچ جہاد کیا ہے۔ جہاد صِرف تیغ و سناں سے لڑنے اور جدال و قتال ہی کا نام نہیں ہے بلکہ نیک مقصد کے لیے خطرات کی پروا نہ کرتے ہُوئے اپنی اِمکانی حد تک جد و جہد کو "جہاد" کہتے ہیں۔ وُہ اُردو کے کُہنہ مشق صحافی تھے اور ساتھ ہی صاحبِ طرز ادیب بھی۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں میری کتاب "روزگارِ فقیر" کا سب سے پہلا ایڈیشن منظرِ عام پر آیا۔ اُس کے چند ماہ بعد مجھے لاہور جانا پڑا۔ وہاں ڈاکٹر محمد داؤد

طارق نے بتایا کہ مولٰینا صلاح الدّین آپ کی کتاب (رُوزگارِ فقیر) پر ریڈیو پاکستان، لاہور سے شام کو تبصرہ نشر کر رہے ہیں۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مَیں نے مولٰینا کا نام سُنا تھا۔ دیکھنے اور ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آدمی اُس سے ملتا ہے، جسے وُہ جانتا ہو۔ مجھے کاروباری ضرورت سے اُسی شام کو کراچی روانہ ہونا تھا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ریڈیائی نشریے اور گاڑی کے وقت میں صرف آدھ گھنٹے کا فرق ہے۔ ڈاکٹر داؤد اور بہاوَل پُور کے مشہور قومی کارکن علاّمہ ارشد نے، جو اُس وقت میرے پاس بیٹھے تھے، اصرار کیا کہ مولٰینا کی تقریر ضرور سُننی چاہیے۔ اُن کے تبصرے بڑے جان دار، باوقار اور مستند ہوتے ہیں۔ وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ وُہ وقت بھی آ گیا کہ مولٰینا صلاح الدّین ریڈیو سے تبصرہ نشر کر رہے ہیں اور ہم ریڈیو سیٹ کے قریب بیٹھے سُن رہے ہیں۔ یہ دس بارہ منٹ کا تبصرہ تھا۔ مَیں نے پہلی بار ریڈیو سے اپنی کتاب پر تبصرہ سُنا۔ تبصرہ ختم ہونے پر میں نے محسوس کیا، یہ چند لمحے میں نے ایک ایسی دُنیا میں گزارے ہیں، جہاں دُنیا کی کسی فکر و تردّد کی پرچھائیں بھی دِکھائی نہیں دیتی۔ ہر طرف خُوشی اور نشاط و کیف کی عمل داری۔ میں الفاظ میں اپنی اس مَسرّت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اندلس کے حکمران امیر عبدُالرّحمٰن ثالث نے اپنے خُود نوشت حالات میں ایک فقرہ لکھا تھا ——

"میرے پچاس سالہ دورِ حکومت میں ایسے دِنوں

کی تعداد، جب کہ مَیں کسی فِکر و اندیشہ کے بغیر بے حد
خوش رہا، ۱۴ دِن سے زیادہ نہ تھی"۔

اِس طرح اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ زِندگی میں حقیقی اور بے پایاں مسرت مجھے کِتنی مُدت حاصِل رہی تو مَیں کِسی تامّل کے بغیر فوراً کہُوں گا کہ "صِرف بارہ منٹ، جب مَیں مولٰینا صلاحُ الدّین کی تقرِیر سُن رہا تھا"۔

اِدھر تبصرہ ختم ہُوا، اُدھر مَیں ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر مولٰینا کے تبصرے کا اثر دِل و دِماغ پر چھایا رہا۔ دُنیا کا کوئی شاعِر اور مصنّف و ادیب تحسِین و ستائش اور قدر شناسی کے جذبے سے یکسر عاری اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر داؤد طارق جو کاروباری مُعاملات میں میرے معاون کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، اُن سے میں نے کمپارٹمنٹ کے سامنے ریلوے پلیٹ فارم پر تاکید کے ساتھ کہا کہ ایک نہایت اہم کام تُمھارے سپُرد ہے سب سے پہلے کل تمھارا کام یہ ہے کہ مولٰینا صلاحُ الدّین کی خدمت میں حاضر ہو کر میری جانب سے نہایت اچھے الفاظ میں شکریہ ادا کرنا اور دو ہزار روپے بطور ہدیہ اُن کی خدمت میں گزارنا۔ میں نے تاکید کی کہ دیکھو، اِس کام میں تاخیر نہ ہو۔ میں کراچی پہنچتے ہی ٹیلی فون پر تم سے دریافت کرُوں گا کہ تم نے یہ کام کر دِیا۔

چنانچہ دُوسرے دِن کراچی پہنچتے ہی مَیں نے سب سے پہلا کام

یہ کیا کہ ٹیلی فون پر کال بُک کرائی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر داؤد سے گفتگو کا موقع مل گیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ مَیں آپ کی ہدایت کے مطابق مولٰینا صلاح الدین احمد کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ آپ کی جانب سے شکریہ ادا کیا اور پھر ایک لفافہ جس میں دو ہزار روپے کے نوٹ تھے، پیش کیا، مگر بالکل خلافِ توقع روپیہ دیکھ کر اُن کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اُنھوں نے یہ کہہ کر روپے مجھے واپس کر دیے ـــــ

"فقیر صاحب نے میرے ایمان کی قیمت بہت کم لگائی ہے"۔

مولٰینا کا یہ جواب سُن کر مجھے ندامت کے مارے پسینہ آگیا۔ عقل نے کہا کہ ہدیے کا بھیجنا اور اُس کا قبُول کرنا تو مسنُون ہے۔ اِس میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر میرے ضمیر نے فوراً چٹکی سی لی اور مَیں پشیمان ہو گیا۔ اِس واقعے کا مجھ پر اِس قدر اثر ہُوا کہ تقریباً بارہ سال تک انتہائی اشتیاق کے باوجود اُن سے ملنے کی جُرأت نہ کر سکا۔

اِس اتّفاق کو یقیناً حُسنِ اتّفاق ہی کہا جائے گا کہ مولٰینا کی وفات سے ایک سال پہلے "روزگارِ فقیر" کی دُوسری جلد ترتیب دی جا رہی تھی تو ایک علمی مشوَرے کی ضرُورت پیش آگئی۔ ڈاکٹر داؤد نے کہا کہ لاہور میں اربابِ نظر اور اہلِ علم کی کمی نہیں ہے، مگر اِس مسئلے میں مولٰینا صلاح الدّین سے ملنا مُناسب اور مُفید ہو گا۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا؛ مولٰینا کے یہاں جاؤں یا نہ جاؤں۔ بارہ برس پہلے کا واقعہ ذہن پر نقش تھا کہ کہیں وُہ اُس دو ہزار

رُوپے کا ذکر کرتے ہُوئے کچھ کہہ نہ دیں، لیکن پھر مَیں نے دل کو مضبوط کیا کہ جو صُورت بھی پیش آئے، مجھے مولٰینا سے بہر حال ملنا ہے۔ مَیں نے کہا کہ "تم مولٰینا سے مِلو اور مُلاقات کا وقت لے لو"۔ 'ادبی دُنیا' کا دفتر دُوسری منزل پر ہے۔ مَیں اپنی خرابیِ صحت کے باعث سیڑھیاں چڑھنے سے قاصر ہُوں۔ اُن کے مکان پر ہی مِلنا ہو سکتا ہے۔ خیر! مُلاقات کا وقت مقرّر ہُوا اور مَیں اُن کی قیام گاہ پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہُوں کہ ایک شخص دراز قد، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، مردانہ وار مُونچھیں، ڈاڑھی مُنڈی ہُوئی، سُوٹ میں ملبُوس، جناح کیپ پہنے کھڑا ہے۔ مَیں نے اس سے پہلے اُن کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ اُن کے نام کے ساتھ "مولٰینا" کی نسبت کے خیال سے جو نقشہ، حُلیہ، چہرہ مُہرہ میرے ذہن نے مُرتّب کیا تھا، وُہ کچھ اور ہی تھا۔ یہ کہ لمبی سفید ڈاڑھی، خواجہ حسن نظامی کی طرح دراز زُلفیں شانوں پر بکھری ہُوئیں۔ نیچا کُرتا، سر پر عمّامہ یا دو پلّی ٹوپی۔ مَیں اُن کو پہچان ہی نہ سکا۔ خود اُنھی سے دریافت کیا۔ مولٰینا صلاحُ الدّین اندر تشریف فرما ہیں؟ جواب دیا گیا: جس سے آپ ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں، وُہ خاکسار یہی ہے۔

اِس کے بعد بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مُصافحہ کیا اور اُس کے بعد مُعانقہ کیا جیسے اُن کی آغوشِ کرم میری مُنتظر تھی۔ پھر وہ مجھے گول کمرے میں لے گئے۔ خیریت پُوچھی۔ کاروبار کے بارے میں گفتگو فرمائی اور

مُفید مشورے بھی دیے۔ اُن کی گفتگو سے خلوص و محبّت کی خوشبو آ رہی تھی، جس کی مہک میرے دِل و دِماغ آج تک محسوس کر رہے ہیں۔ فرمانے لگے: "افسوس ہے، میری بیوی کا چند ماہ ہُوئے، اِنتقال ہو گیا۔ وُہ زِندہ ہوتیں تو اُن کی زبان سے آپ کو ایک بات سُنواتا۔" پھر قدرے تأمّل کے بعد خُود ہی بولے: "بیوی کے مرنے سے چند مہینے پہلے مَیں خُود سخت بیمار ہو گیا۔ مرض نے اِتنا طُول کھینچا اور اِس قدر شِدّت اِختیار کی کہ جینے کے لالے پڑ گئے۔ اِس عالم میں بیوی کو مَیں نے وصیّت کی کہ دیکھو! میرے بعد اگر تمھیں کوئی مشکل درپیش آئے تو فقیر وحیدُالدّین سے رجُوع کرنا۔"

یہ سُن کر فرطِ ادب سے میرا سَر جھک گیا۔ مَیں نے عرض کیا کہ مولٰینا! مُجھ ناچیز کے بارے میں آپ کا یہ حُسنِ ظَن اور اِس قدر اِعتماد میرے لِیے فخر و سعادت کی لازوال دَولت ہے۔ اب جب کبھی اِس واقعے کا خیال آتا ہے تو مولٰینا کے اِس اِعتماد کو اُن کے کمالِ اِخلاص پر محمُول کرتا ہُوں۔

اِس موقع پر لگے ہاتھوں ایک لطیفہ بھی سُن لیجیے۔ ڈاکٹر محمّد داؤد جو طارق تخلّص کرتے ہیں، بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ کتابیں جمع کرنے اور موقع بے موقع شعر پڑھنے کا اُنھیں بہت شوق ہے۔ اُن کے شعر پڑھنے کے بہت سے لطیفے ہیں۔ ایک دفعہ کراچی میں میرے پاس بعض احباب

بیٹھے تھے۔ مولینا قمرالحسن تھانوی بھی تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر داؤد طارق ہماری گفتگو میں جب بھی حصّہ لیتے، ایک آدھ شعر ضرور پڑھ دیتے۔ ان اشعار کا موقع محل سے کوئی تعلّق نہ تھا اور غالباً دو تین شعر بے وزن بھی تھے۔ مولینا ڈاکٹر صاحب کا مُنہ حیرت سے تکنے لگے۔ مَیں اُن کی اِس حیرت کو تاڑ گیا۔ میں نے کہا: "مولینا! اِس میں شاعر کا کوئی قصوُر نہیں ہے"۔ مولینا اِس مُختصر سے فِقرے سے سب کچُھ سمجھ گئے اور پھر زور سے قہقہہ لگایا۔

مولینا صلاحُ الدّین صاحب کی خدمت میں بھی ڈاکٹر داؤد حاضر ہوتے رہتے تھے اور شعر کے مُعاملے میں مولینا کو اِن کی بدیہہ گوئی اور ذوقِ اِنتخاب سے سابقہ پڑ چُکا تھا، بلکہ یوُں کہیے، بہُت سے "سانحے" پیش آ چُکے تھے۔ ایک بار صُبح کے وقت مولینا مال روڈ پر ہماری دُکان سیّد برادرز کے سامنے سے گُزر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحِب اُنھیں دیکھتے ہی مَحبّت سے آگے بڑھے، مولینا کو سلام کِیا اور کسی تمہید کے بغیر یہ شعر سُنا ڈالا:

غمِ زندگی کو عدم ساتھ لے کر
کہاں جا رہے ہو سویرے سویرے

مولینا بے ساختہ مُسکرا دِیے۔ اِس قِسم کی "سادہ لوحی" پر شریف آدمی خفا نہیں ہُوا کرتے۔ مولینا نے فوراً دو شعر پڑھے:

گئے ہم کل سویرے ہی سویرے
سلامُ اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں پر دیکھے کچھ طفل پری زد

ارے رے، ارے رے، ارے رے، ارے رے!

مولینا فضا میں لطف و تفنّن کی موج پیدا کر کے، اپنی چھڑی گھماتے ہوئے ماہنامہ "ادبی دُنیا" کے دفتر کی طرف چلے گئے۔

———— ○ ————

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

ڈاکٹر محمد دین تاثیر دُنیائے علم و ادب کی ایک معرُوف شخصیت ہیں مرحُوم اہلِ قلم، ناقد اور تعلیمات کے ماہر ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ اُن کے بعض ایسے اشعار ——

داورِ حشر! مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اِس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

ادَبی صُحبتوں اور نجی نشستوں میں دُہرائے جاتے ہیں اور اربابِ ذوق اُن سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر نے اپنی زندگی علم وادَب کے لیے وقف کر دی تھی۔ یُوں تو میں برسوں سے اُن کا شناسا تھا، مگر دُوسری جنگِ عظیم کے دوران میں جبکہ حسنِ اتفاق سے اُن کا اور میرا تقرر ایک ہی محکمے میں ہُوا، اُنھیں قریب بلکہ بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا۔ میرا اور اُن کا کمرہ مِلا ہُوا تھا۔ اُن کا زیادہ وقت میرے کمرے میں گزرتا۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگ اکٹھے کھاتے۔ فیض صاحب سے میرا پہلا تعارف ڈاکٹر تاثیر ہی نے کرایا تھا۔ میں اُن کا احسان مند ہُوں کہ اُن کی بدولت فیض جیسا صاحب اخلاص وکردار دوست مجھے میسّر آیا۔ یہ دُنیا جس سے آج ہم گزر رہے ہیں، اغراض ونفسانفسی کی دُنیا ہے۔ زندگیاں بالکل تجارتی بن کر رہ گئی ہیں۔ ایسے دَور میں اخلاص ووفا کی پرچھائیں بھی اگر کہیں مل جائے تو اُسے غنیمت بلکہ بہت بڑی دولت سمجھنا چاہیے۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

اُن کا بندہ ہُوں جو بندے ہیں محبّت والے (ذوق)

تاثیر مرحوم بڑے زندہ دِل اور خُوش طبع انسان تھے ـــــ ایک اصطلاح ''زندہ دلانِ پنجاب'' کی شہرت پا گئی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر اس کا صحیح مصداق تھے۔ اپنی خُوش مزاجی اور بذلہ سنجی کے سبب وہ ہر محفل میں نمایاں نظر آتے۔ ہماری نجی صحبتیں اور محفلیں اُن کی مُسکراہٹوں اور قہقہوں سے پُررَونق اور سجی ہُوئی رہتیں۔ وُہ ہنسی ہنسی میں علمی نکتے بھی بیان کر جاتے۔ ایسے نُکتے اور لطیفے، جن سے معلُومات میں اضافہ ہوتا۔

راقم الحرُوف کو اچھّی طرح یاد ہے کہ ایک بار وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ کہنے لگے، مولانا آج کل اپنی سوانح عُمری لکھ رہے ہیں۔ اُس کے سَرنامہ کے لیے جو شعر مولٰینا موصُوف نے مُنتخب کیا ہے، وُہ اِتنا موزُوں اور مُناسب ہے کہ شائد

سارے ادب میں اِس سے زیادہ موزوں شعر سوانح عمری کے لیے نہیں
مل سکتا۔ پھر ڈاکٹر تاثیر نے فارسی کا یہ شعر اپنے مخصوص انداز میں لطف
لے کر بلکہ جھوم کر پڑھا ـــــــ

ہر کسے را دامنِ تر ہست اما دیگراں
باز می پوشند و ما در آفتاب انداختیم

اور پھر خود ہی اِس شعر کا مفہوم بھی سمجھایا کہ ـــــــ

"ہر کسی کا دامن کمزوریوں اور لغزشوں سے تر
اور آلودہ ہے۔ بعض اِس معصیت آلودہ لباس کو
دوبارہ پہن لیتے ہیں، لیکن مَیں نے اپنا تر دامن
آفتاب کی روشنی میں رکھ دیا ہے (تاکہ سب
اُسے دیکھ سکیں)۔"

یا یہ کہ

"مَیں نے اپنا دامنِ تر آفتابِ رحمت کی
دُھوپ میں رکھ دیا ہے تاکہ اس کی تری جاتی رہے
اور یہ خشک ہو جائے۔"

جب مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب "ابوالکلام کی کہانی،
خود اُن کی زبانی" منظرِ عام پر آئی تو یہ شعر اُس کے دیباچے میں
موجود تھا۔

تاثیر مرحوم کی زندگی کے بعض حالات "روزگارِ فقیر"، جلد دوم میں بیان کر چکا ہوں، یہ کہ اُن کو علامہ اقبالؔ کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل رہا۔ علاّمہ کے افکار اور شاعری سے وہ کتنا گہرا شغف رکھتے تھے اور مرحوم خود اپنی جگہ کتنی بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ لاہور کے علم وادب کی تاریخ ڈاکٹر تاثیرؔ کے ذکر کے بغیر اُدھوری سمجھی جائے گی۔ اُن کی شخصیت میں شعر و نغمہ کی سی دلکشی، اور اُن کے کلام و پیام میں لالہ و گل کی سی شگفتگی موجود تھی۔

وہ کیا گئے، دوستی اور شرافت، محبت اور اخلاص کا ایک دور اپنے ساتھ لے گئے۔

قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح

مسٹر محمد علی جناح ایک نامور وکیل اور با اصول دانشور کی حیثیت سے مُتّحدہ ہندوستان میں جانے پہچانے جاتے تھے، مگر پاکستان کی تحریک اور اِس سلسلے میں مُسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشاکش نے اُن کی قیادت کو شہرت دی اور اُن کی پُر خلوص رہنمائی میں اِس تحریک کو کامیابی نصیب ہُوئی۔ ۴۵-۱۹۴۶ء میں بس دو ہی شخصیتیں مُتّحدہ ہندوستان میں سب سے نُمایاں اور مُمتاز نظر آتی تھیں: ہندوؤں میں گاندھی جی اور مُسلمانوں میں "محمد علی جناح"۔ قوم نے اُن کو اپنا قائد نہیں "قائدِ اعظم" تسلیم کیا۔

اُنھی دنوں مَیں کسی سرکاری کام سے بمبئی کے دَورے پر گیا ہُوا تھا اور وہاں اپنے عزیز سیّد واجد علی کے یہاں مقیم تھا۔ واجد علی اکثر و بیشتر قائدِ اعظم کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اِس سے مُجھے اندازہ ہُوا کہ وُہ اُن کی

ذات سے خاص دلچسپی بلکہ عقیدت رکھتے ہیں اور قائدِ اعظم بھی اُن پر مہربانی فرماتے ہیں اور اُن سے ملاقات کے لیے عزیز موصوف کو کوئی رسمی دُشواری پیش نہیں آتی۔ یہ جان کر میں نے بے تکلفی کے انداز میں واجد علی سے کہا ـــــ

"بھئی! قائدِ اعظم سے ہماری مُلاقات بھی کراؤ!"

واجد علی نے کہا "خاطر جمع رکھو۔ مُلاقات بھی ہو جائے گی ـــ"

اُنھوں نے قائدِ اعظم کی قیام گاہ واقع مالابار ہِل پر ٹیلی فون کیا اور اپنی مُلاقات کے لیے وقت لیتے ہُوئے کہا کہ میرا ایک عزیز بھی میرے ہمراہ آنا چاہتا ہے۔ قائدِ اعظم نے جواب میں غالباً اجازت دے دی۔ میری خوشی کا کیا پُوچھنا۔ متّحدہ ہندوستان میں مُسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما سے شرفِ مُلاقات کا موقع مِل رہا تھا۔ اُن دنوں انگریزی حکومت نے فوجی افسروں کو ہر وقت باوردی رہنے کی سختی کے ساتھ ہدایت کر رکھّی تھی اور میری طبیعت نے اس کو کسی طرح گوارا نہ کیا کہ فوجی لباس پہن کر قائدِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہوں۔ سرکاری حکم و ہدایت کے برخلاف میں نے شہری لباس پہنا اور واجد علی کے ہمراہ قائدِ اعظم سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

علّامہ شبلی نعمانی نے حضرتِ حافظ شیرازی کے شعر میں تصرف کرتے ہُوئے فرمایا ہے ـــــ

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنّت نہ خواہی یافت
کنارِ آبِ چوپاٹی و گُل گشتِ اپالو را

شبلی نعمانی کے زمانے میں "میرن ڈرائیو" (Marine Drive)
کہاں بنا تھا۔ سمندر کا کنارا جسے چوپاٹی کہا جاتا ہے، یہی سب کچھ تھا۔
اسی چوپاٹی سے گزر کر ہماری موٹر کار مالابار ہل پر چڑھنے لگی۔ یہ منظر
واقعی پُر کشش تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں قائدِ اعظم کی قیام گاہ آگئی۔ ہم
زینہ طے کرتے ہُوئے بالائی منزل پر پہنچے۔ وہاں قائدِ اعظم اپنی ہمشیرہ
(محترمہ فاطمہ جناح) کے ہمراہ ایک صوفے پر رونق افروز تھے۔ وُہ بڑے
تپاک سے ملے۔ مصافحہ کیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ واجد علی نے میرا
تعارُف قائدِ اعظم سے کرایا۔ قائدِ اعظم نے مجھ سے دریافت کیا:

"تم I.M.S. میں ڈاکٹری میں کرنل ہو یا ریگولر آرمی میں؟"

مَیں نے کہا ــــ "ڈاکٹر نہیں ہُوں۔"

اُس زمانے میں فوج کا یہ عُہدہ ہندوستانیوں کو بہت کم ملتا
تھا۔ قائدِ اعظم غالباً یہی بات معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اِس ملاقات میں
کئی موضُوعات پر باتیں ہُوئیں، لیکن سب سے زیادہ اہم بلکہ گرم موضُوع
(Burning Topic) شملہ کانفرنس کا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا: مَیں آج
ہی شملہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے جا رہا ہُوں۔ پھر قدرے
رُک کر حسرت آمیز لہجے میں بولے:

"دیکھو، مَیں یہاں تن تنہا بیٹھا ہُوں اور مُسلمانوں کا
پُورا مقدّمہ (Case) تیّار کر رہا ہُوں۔ اور عین اِس
مکان کے سامنے انڈین نیشنل کانگریس کے بہترین دماغ
مِل جُل کر جواب دعوٰی تیّار کر رہے ہیں۔"

مَیں نے اس مختصر سی مُلاقات میں محسُوس کیا کہ دس کروڑ مُسلمانوں کے مستقبل کی اِتنی بھاری ذمّہ داریاں اپنے منحنی کاندھوں پر سنبھالنے کے باوجُود وُہ پُرامیّد ہیں اور کسی قسم کی بے یقینی اور اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ اُنھیں اس دن سفر کرنا تھا اور سفر بھی کس قدر ہنگامہ آفریں سفر! اُن کی مصرُوفیات بھی غیر معمُولی تھیں۔ مگر اس کے باوجود اُنھوں نے ملاقات کے دوران اپنے اضطراب، عُجلت اور بڑھتی ہُوئی مصروفیت کا احساس ہمیں نہیں ہونے دیا۔ اُن کی جگہ کوئی دُوسرا ہوتا تو اپنے اِضطراب کو شاید نہ چھپا سکتا۔ ہم نے خود اُٹھ کر اجازت چاہی۔ تب اُنھوں نے ہمیں رُخصت کیا۔

ہم دونوں راستہ بھر یہی گفتگو کرتے آئے کہ قائدِاعظم ضعیفُ العمری اور جسمانی کمزوری کے باوجُود قوم کے لیے اِس قدر جانفشانی کر رہے ہیں۔ اُن کی خود اِعتمادی اور قوّتِ ارادی کس قدر مضبُوط ہے اور کانگریس بلکہ پُوری ہندُو قوم کی مُخالفت، سیاسی بازی گری اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں کے باوجُود قائدِ اعظم اپنے نصبُ العین کی

صداقت اور کامیابی پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

واجد علی نے مجھے بتایا کہ ایک روز قائدِ اعظم نے کہا ——

"کیا بتایا جائے، ڈاک میں اتنی تعداد میں خطوط آتے ہیں کہ اُن کے جوابات دینے میں خاصا وقت صَرف ہو جاتا ہے۔"

واجد علی نے جواب میں عرض کیا "آپ حکم دیں تو میں حاضر ہو جایا کروں اور خطوط کا جواب آپ کی ہدایت کے مطابق لکھ دیا کروں۔"

اِس پر قائدِ اعظم نے فرمایا ——

"تم ایک بات بھول رہے ہو کہ یہ خط جناح کے نام آتے ہیں اور کسی کے نام نہیں۔"

یہ نکتہ بعد میں غور و فکر سے سمجھ میں آیا کہ ہر خط لکھنے والے کا یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جس کو خط کے ذریعے مخاطب کرے، وہی اس کا جواب دے۔

قائدِ اعظمؒ کی شخصیت بلند حوصلگی، کردار کی پختگی اور اصولوں پر ثابت قدمی کا بہترین نمونہ تھی۔ اُن کے سیاسی موقف سے اختلاف رکھنے والے بھی اُن کی اِس خوبی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اُن کو کسی مصلحت، لالچ یا فریب سے خریدا نہیں جا سکتا تھا۔ اُن کی شخصیت اور اُن کے اصول Unpurchasable تھے۔ قائدِ اعظم جیسی ہستیاں قوموں کو صدیوں بعد ہی میسّر آتی ہیں۔

میاں افتخار الدّین

والد کا نام میاں جمال الدین تھا۔ لاہور کی مشہور بستی باغبان پورہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کا گھرانہ لاہور شہر کے ممتاز اور خوشحال گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ میرے بزرگ فقیر سیّد افتخار الدین کے ساتھ ان کے والد کے گہرے مراسم تھے۔ دونوں دوست اولادِ نرینہ کی دولت سے محرُوم تھے۔ ایک دن دونوں دوستوں کے درمیان بات چیت میں اپنی اس محرُومیِ قسمت کا ذِکر بھی آیا۔ آخر دونوں نے ایک ہی نشست میں فیصلہ کیا کہ ایک ایک شادی اور کر کے دیکھیں۔ کیا عجب ہے کہ اِس طرح قسمت یاوری کرے۔ یہ بھی طے پایا کہ میاں جمال الدّین کے ہاں لڑکا پیدا ہو تو اُس کا نام اپنے دوست فقیر افتخارُالدّین کے نام پر اِفتخارُالدّین رکھیں گے اور اگر فقیر افتخار الدّین کے گھر نُورِ نظر تولّد ہُوا تو وہ میاں جمالُ الدّین کے قریبی عزیز کے نام پر اس نومولُود کا نام سراج الدّین تجویز کریں گے۔ چُنانچہ دونوں دوستوں نے

نکاحِ ثانی کیا اور یہ حُسنِ اتفاق اللہ تعالیٰ ہی کے کرم کا ظہور تھا کہ دونوں کے یہاں فرزند پیدا ہوئے اور جس طرح بات طے پائی تھی اُسی کے مطابق بچّوں کے نام رکھے گئے۔ اُس زمانے میں دوستی کے رِشتے بڑے مضبوط ہوتے تھے۔ اِس کا اندازہ اِس سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقیر سیّد افتخار الدین کا جب اِنتقال ہُوا ہے، اُن کے فرزند فقیر سراج الدین کی عُمر ایک سال کی تھی۔ اُنھوں نے اپنی وصیّت میں کنبے کے عزیزوں اور خاندانی رشتہ داروں کی بجائے اپنے نابالغ بیٹے کا سرپرست میاں جمال الدّین کو مقرّر کیا۔ حالانکہ خاندان میں متموّل لوگ بھی موجود تھے اور سرکاری اعلیٰ عُہدیدار بھی۔

میاں جمال الدّین کی دوستی اور محبّت کا ایک ایسا واقعہ مجھے یاد ہے کہ جب بھی اُس کا خیال آتا ہے تو بے اِختیار رونے کو جی چاہتا ہے اور مجھ گنہگار کی پلکیں اُسی وقت پُرنم ہو جاتی ہیں۔ ہائے، وُہ خلوص اور محبّت جو اُس زمانے کے بزرگوں کا شیوہ تھی، کہاں چلی گئی؛ اب تو جدھر نگاہ دوڑائیے، اخلاص و وفا کے معاملے میں سنّاٹا اور ہُو کا عالم نظر آتا ہے۔

فقیر سیّد افتخار الدّین کا جب اِنتقال ہُوا تو راقم الحرُوف کی عُمر بہ مشکل دس بارہ سال کی ہوگی۔ اُن کی تدفین کے بعد میاں جمالُ الدین کا یہ معمُول تھا کہ وہ باغبان پورہ سے آٹھ دس میل کا فاصلہ طے کر کے قبرستان آتے۔ اُن کے ہمراہ ایک بزرگ بھی ضرُور ہوتے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد اُن بزرگ سے دریافت کرتے کہ آپ "کشف" کے ذریعے معلوم کر کے مجھے

بتائیں کہ میرے دوست کا کیا حال ہے۔ "کشفِ قبور" صاحبانِ حال اور اہل اللہ کی مشہور و معروف کرامت ہے۔

فقیر افتخارالدین کے انتقال کے بعد اُن کی ضعیف والدہ کئی سال تک اپنے اطاعت شعار نامور فرزند کی موت کا غم برداشت کرنے کے لیے زندہ رہیں۔ ایک دن اُن بزرگ نے میاں جمال الدین سے کہا کہ تمھارے دوست کی رُوح بے چین اور مضطرب نظر آتی ہے۔ غالباً اُن کی والدہ اُن سے ناراض ہیں۔ میاں جمالُ الدین یہ بات سُنتے ہی قبرستان سے سیدھے ہمارے گھر آئے۔ اُس زمانے میں شرم و حیا سے گھریلو فضائیں معمور تھیں۔ خواتین سختی کے ساتھ پردے کی پابند تھیں۔ بے پردگی بہت بڑا عیب سمجھی جاتی تھی۔ مَیں مرحومہ کا پڑپوتا تھا، لیکن میں نے کبھی اُن کے سر کو، جس کے تمام بال برف کی مانند سپید تھے، دوپٹّہ اور چادر سے خالی نہیں دیکھا۔

میاں جمالُ الدین نے اندر کہلوایا کہ میں والدہ کو سلام کرنے کے لیے حاضر ہُوا ہُوں۔ زنان خانے میں اطّلاع پہنچی تو فوراً پردے کا اہتمام ہُوا۔ فقیر افتخارُالدین کی والدہ پردے کے پیچھے کھڑی ہُوئیں۔ میاں صاحب سر پر دستار باندھے ڈیوڑھی میں داخل ہُوئے اور آتے ہی اپنی پگڑی فقیر افتخارُالدین کی والدہ کے قدموں پر رکھ دی اور آبدیدہ ہوکر دل گرفتہ انداز میں عرض کیا کہ "خدا کے لیے میرے دوست اور اپنے

مرحُوم بیٹے کو دل سے مُعاف کر دیجیے"۔ جب تک مرحُوم دوست کی والدہ نے یہ نہ کہہ دِیا کہ "افتخارُالدّین کو مَیں نے معاف کیا۔ میرے اللہ نے معاف کِیا" میاں صاحب نے اُن کے قدموں سے اپنی دستار نہ اُٹھائی۔

ایک بار، مَیں لاہور میں موجُود تھا۔ اچانک معلُوم ہُوا کہ میاں صاحب بیمار ہیں اور صاحبِ فراش ہیں۔ مَیں اِس خبر کے سُننتے ہی عیادت کے لیے اُن کی کوٹھی پہنچا۔ بتایا گیا کہ میاں صاحب پر دل کا شدِید دورہ پڑا ہے۔ ڈاکٹروں کی سخت ہدایت ہے کہ اُن کے پاس کسی کو نہ جانے دِیا جائے۔ مَیں اُن کے لڑکے عارف اِفتخار، جو آج کل قومی اسمبلی کے ممبر ہیں، کے پاس بیٹھ کر واپس چلا آیا۔ دُوسرے دِن پھر گیا تو اُس دوران میں عارف اِفتخار، میرے آنے کا ذکر اُن سے کر چُکے تھے۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ آپ کے واپس چلے جانے کا جب والد صاحب کو عِلم ہُوا تو سخت ناراض ہُوئے اور تاکید کی کہ اب جب بھی وُہ آئیں اور میری حالت چاہے کیسی ہو، اُن کو مُجھ سے ضرُور مِلایا جائے۔

چُنانچہ میں اندر گیا۔ میں نے سلام کِیا۔ اُنھوں نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دِیا۔ مَیں نے عیادت کے طور پر سُنّتِ نبوی کے مُطابق تسلّی آمیز الفاظ کہے کہ آپ اِنشاءاللہ، اچّھے ہو جائیں گے۔ بیماری تو تندرُستی کی زکوٰۃ ہے۔ میاں صاحب بیماری کی شدّت کے باوجُود حسبِ معمُول مُسکراتے رہے۔

میاں افتخار الدین آخر میاں جمال الدین کے فرزند تھے۔ وضعداری اور بے غرض دوستی میں وہ اپنے باپ کے سچّے وارث تھے۔ راقم الحروف سے جب بھی ملتے، خلوص و محبّت کے ساتھ ملتے، جیسے دِکھاوے اور دُنیا داری کی اُنھیں ہوا تک نہ لگی تھی ڈاکٹروں نے انھیں مکمّل آرام کا مشورہ دیا، لیکن اُن کی قوّتِ عمل نے اسے گوارا نہ کیا اور طبیعت ذرا سنبھلتے ہی اُنھوں نے چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

اُن کی بیماری کے اِس واقعے کے چند دن بعد ایک شام کو میں اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کو ساتھ لے کر گلبرگ نہر کے کنارے، چہل قدمی کر رہا تھا کہ اتنے میں سامنے سے ایک کار فرّاٹے بھرتی ہُوئی آئی اور ہمارے قریب سے گزر گئی۔ تقریباً نصف فرلانگ جانے کے بعد وُہ موٹر اچانک رُک گئی۔ ہم نے حیرت سے دیکھا کہ گاڑی کا دروازہ کھُلا اور اُس سے اُترنے والے شخص نے ہماری طرف تیزی سے دوڑنا شروع کر دِیا۔

ہم حیران تھے کہ یہ آخر ماجرا کیا ہے۔ جب وُہ صاحب قریب پہنچے تو پتہ چلا کہ یہ تو میاں اِفتخار الدین ہیں۔ اُنھوں نے آتے ہی بے اختیار ہو کر مجھے گلے لگا لیا۔ اُن کے خلوص و محبت کی بار بار معانقے سے بھی سیری نہیں ہُوئی۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر میرا مُنہ چُوم لیا۔ پھر مجھ سے میری صحت کے بارے میں دریافت کیا اور اس کے بعد گاڑی میں سوار ہو کر چلے گئے۔ میرے

لڑکے نے جس کی عمر اُس وقت تیرہ سال کی تھی، جب سے ہوش سنبھالا ہے، خلوص و محبّت کی سادگی اور بے تکلّفی کا ایسا منظر ہی کبھی نہ دیکھا تھا۔ حیرت کے ساتھ مجھ سے پُوچھا کہ یہ کون صاحب تھے۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ میاں اِفتخارالدین تھے جو صُوبائی حکومت کے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ شہر کے بہت بڑے دولت مند اور نامور آدمی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بزرگوں کی شفقت و محبّت اور وضع داری کا صحیح نمُونہ ہیں۔

مرحُوم اچھّے مقرّر تھے۔ اِشتراکیت کی طرف طبیعت کا میلان تھا، اِس لیے اِظہارِ خیال میں بے باک اور جری تھے۔ "اقتدار سے نفرت بلکہ ٹکراؤ" اُن کا مِشن تھا۔ اِس مِشن کے لیے وُہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے اور نفع و نقصان کو خاطر میں نہ لاتے۔

مَیں نے "روزگارِ فقیر" کا نقشِ اوّل ۱۹۵۰ء میں شائع کرانا چاہا تو یہ کام میاں اِفتخارالدین کے سپُرد کر دیا۔

اُنھوں نے پاکستان ٹائمز پریس میں اپنی زیرِ نگرانی اِس کتاب کو اِس قدر آب و تاب کے ساتھ چھپوایا کہ پاکستانی طباعت کا حسین ترین نمُونہ دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔

راقم الحروف نے اِس کتاب کی شاندار طباعت کے سلسلے میں اُن پر جو برادرانہ اِعتماد کیا تھا اور اُن کی ذات سے جو توقّعات قائم کی تھیں، وُہ اِس حُسن و خوُبی کے ساتھ پوُری ہوئیں کہ میرے دِل

پر اُن کی فرض شناسی کا نقش قائم ہو گیا۔

میاں افتخار الدّین کے پاس اگرچہ دُنیادی دولت و ثروت کی کوئی کمی نہ تھی، لیکن ساری زندگی اُنھوں نے اپنی کوششیں محنت کش اور غریب عوام کی برتری، خوشحالی اور سربلندی کے لیے وقف رکھّیں۔ اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے پُوری جرأت کا مظاہرہ کیا اور ہمیشہ کلمۂ حق کہا۔ انسانیت کے سب سے بڑے محسن (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) نے فرمایا ہے:

"جابر سُلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے"۔

—— ○ ——
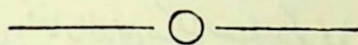
ڈی۔ایل مل ایڈوکیٹ

سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے، مجھے ایک مقدمے کے سلسلے میں کسی تجربہ کار اور لائق وکیل سے مشورہ لینا تھا۔ ایک دوست نے کہا، حیدرآباد میں مسٹر ڈی۔ایل مل نہایت ہی قابل، معاملہ فہم اور تجربہ کار قانون داں ہیں۔ اُن سے جاکر ملو۔ چنانچہ میں اپنے دوست کے مشورے کے مطابق حیدرآباد پہنچا اور مسٹر ڈی۔ایل مل سے اِبتدائی ملاقات ہی میں اس کا اندازہ ہوگیا کہ یہ مُعمّر وکیل قانون میں تو مہارت رکھتا ہی ہے، مگر اس کے علاوہ زندگی کے دُوسرے معاملات اور شعبوں میں بھی اُس کی رائے صائب ہوتی ہے۔ میں نے اُن کے چہرے پر بشاشت اور اِطمینان و مسرّت کی جو لہر دیکھی، اُسے شاید میں کبھی نہیں بھُول سکوں گا۔

وکیل صاحب نے مجھ سے جو اِبتدائی سوالات کیے، انھی سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ اس سن رسیدہ شخص کی وکالت مقدّمے کے لیے

مفید ثابت ہوگی اور ساتھ ہی مجھے مقدّمے کی زیادہ تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ انھوں نے مقدّمے کے بارے میں چند باتیں پُوچھیں۔ اُن کے سوالات بہُت مختصر تھے، مگر نہایت جامع ؛ مقدّمے کی کیا نوعیّت ہے ؟ میں کیا چاہتا ہُوں ؟ اِس کی پیروی کے لیے کس تیاری کی ضرورت ہے ؟ تمام نکات وُہ سمجھ گئے۔ ذہانت اجمال ہی سے تفصیل پیدا کر لیتی ہے۔ جو لوگ بلیدُ الذّہن ہوتے ہیں، اُن کا یہ حال دیکھا گیا ہے کہ یوسفؑ و زلیخّا کے پُورے قِصّے کو پڑھ کر اور سُن کر وُہ اِس بات کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ زلیخا عورت تھی یا مرد۔

میں مقدّمے کے سلسلے میں اُنھیں وکیل کرنے آیا تھا، مگر اُن کی گفتگو، وضع قطع اور برتاؤ کو دیکھ کر اُن کی ذات سے دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔ میں نے قدرے بے تکلفی کے انداز میں اُن سے پُوچھا ــــــ

”ل صاحب! آپ کے کتنے بچّے ہیں ؟“

میرے اِس مختصر سے سوال سے وُہ سمجھ گئے کہ مَیں اُن کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں کچھ معلُومات حاصل کرنا چاہتا ہُوں۔ وُہ بولے، بھائی ! میں تمھارے سوال سے زیادہ کچھ باتیں اپنی زندگی کے بارے میں سُنانا چاہتا ہوں۔ اُن کے اِس کہنے پر مَیں خوش ہو گیا۔ اُن سے ”بچّوں“ کے بارے میں سوال مَیں نے اِسی لیے کیا تھا کہ اِس طرح انھیں اپنی زندگی کے کچھ حالات بھی لازماً بیان کرنا پڑیں گے۔ اُنھوں نے کُرسی کے ہتّھے پر کُہنی

ٹیک کر بڑے اطمینان کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"میری ماں کا جب آخری وقت تھا تو اُنھوں نے میرا ہاتھ میرے بڑے بھائی کے ہاتھ میں دیتے ہُوئے اُنھیں وصیت کی: "یہ تمھارا چھوٹا بھائی میری امانت ہے۔ اِس کی پُوری طرح حفاظت کرنا اور اِس کا اچھی طرح خیال رکھنا۔"

"میرے بڑے بھائی سرکاری ملازمت میں تھے اور تنخواہ جو آمدنی اور معاش کا اصل ذریعہ تھی، محدُود تھی، لیکن اُنھوں نے میری پرورش اور تعلیم و تربیت کی خاطر اپنے اخراجات میں کمی کر دی۔ معیّن اوقات میں ایسی نوبت بھی آگئی کہ کورس کی کتابیں خریدنے کے لیے انھیں اپنی بیوی یعنی میری بھاوج کا زیور تک فروخت کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اُن کی نتھ تک بِک گئی۔ میرے بڑے بھائی کا یہ معمُول تھا کہ جب کوئی نیا لباس بنواتے یا جُوتا خریدتے تو پہلے مجھے پہناتے۔ جب مَیں اُسے کچھ دن استعمال کر لیتا تو میرے اُترے ہُوئے کپڑے وہ خود پہنتے۔ اُنھوں نے مجھے ماں باپ سے بڑھ کر پیار و محبّت کے ساتھ پالا۔ اُن کے ایثار و قربانی کی بدولت میں بے فکری کے ساتھ تعلیمی ڈِگریاں حاصل کرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں ایل ایل۔ بی ہو گیا اور پھر میں نے وکالت شرُوع کر دی۔ افسوس ہے کہ جب بھائی کی خدمت کرنے کا موقع مجھے ملا تو وہ اِس دُنیا سے کُوچ کر گئے۔" یہ کہتے ہُوئے وکیل صاحب کا چہرہ

احساس غم سے سنولا گیا۔

"اُن کے بیوی بچّوں کا کیا ہُوا۔؟" راقم الحروف نے جلدی سے دریافت کیا۔ اِس پر وہ بولے، "آپ ذرا صبر سے کام لیں۔ میں سب کچھ آپ کو بتائے دیتا ہُوں ـــ سُنیے ـــ"

"بھائی صاحب نے میری بیوہ بھاوج کے علاوہ کئی بچّے چھوڑے۔ میری شادی نہیں ہُوئی تھی۔ لوگوں نے شادی کا مشورہ دیا بلکہ اصرار کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ مجھے خدا نے جب بنا بنایا کُنبہ دیا ہے تو نئے کُنبے کی داغ بیل ڈالنے کی کیا ضرُورت ہے۔ چنانچہ میں نے شادی نہ کرنے کا تہیّہ کر لیا اور اب میری پُوری آمدنی میری بھاوَج اور اُن کی اولاد پر صَرف ہونے لگی۔ میری بھاوَج، جن کا میں اپنی سگی ماں کی طرح احترام کرتا تھا، بڑی نیک بلکہ دھرماتما عورت تھی۔ گھر کا سارا انتظام میں نے اُنھیں کو دے رکھا تھا۔ گھر میں اُنھی کی مرضی چلتی تھی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اُن کی رائے سے اختلاف کیا ہو۔"

"اور ـــــ" مسٹر ڈی۔ ایل ئل نے میری طرف خاص نظروں سے دیکھا جیسے وہ میرے چہرے سے میرے جذبات کا جائزہ لے رہے ہوں۔ اُنھوں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہُوئے فرمایا ـــــ

تم کو یہ سُن کر شاید بڑا اچنبھا ہوگا کہ میرے بڑے بھائی کو گزرے ہُوئے ایک زمانہ ہوچکا ہے اور میں اب بہتّر سال کا بوڑھا ہُوں، مگر میں

نے اُن کے اِنتقال کے وقت سے اب تک کوئی نیا کپڑا اُس وقت تک نہیں پہنا، جب تک اُسے میرے بھتیجوں نے نہ پہن لیا ہو۔ حتّٰی کہ تولیہ تک پہلے میرے بھتیجے استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ میرے استعمال میں آتی ہے۔ میری تمام مسرّتیں بھائی کی اولاد کے لیے وقف ہیں۔ میرے شفیق و محسن بھائی نے میرے لیے اپنی ہر خوشی کو قربان کر دیا تھا۔ میں اُن کے احسانات کا بدلہ کیا دے سکتا ہُوں۔ پھر بھی اپنی حد تک اُن کی اولاد کے لیے جو کچھ مجھ سے بن پڑ رہا ہے، کر رہا ہُوں۔ اُنھیں سُکھی اور مطمئن دیکھ کر میری رُوح کو سچّی خوشی حاصل ہوتی ہے اور یہی خوشی میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔"

مسٹر ڈی ایل مل کا زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ ہی کچھ کم غیر معمُولی بات نہ تھی کہ اُنھوں نے مجھے مزید بتایا کہ ـــــ بھائی! میں ایک ایسا آدمی ہُوں، جس نے زندگی بھر کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگایا اور میں آج تک زن و مرد کے جسمانی تعلّق اور قرب سے بالکل ہی نا آشنا ہُوں۔

مسٹر مل کی زبان سے اُن کی یہ اثر انگیز اور خلوص و محبّت سے لبریز آپ بیتی سُننے کے بعد اُن کی ذات سے مجھے بڑی دلچسپی ہو گئی۔ میں بعد کی ملاقاتوں میں اُن کی زندگی کے حالات اور معاملات کو غور سے دیکھنے لگا۔ تنقید کی نیّت سے نہیں، کچھ حاصل کرنے اور سبق لینے کے لیے۔ میں نے محسُوس کیا کہ وہ وکیل ہونے کے باوجُود بے طمع ہیں۔ کسی مقدمے کو

لیتے وقت اگر انھیں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کا مؤکل مظلوم اور غریب ہے تو وہ اُس سے محنتانہ لینے سے اِنکار کر دیتے اور معاوضے کے بغیر پُوری دِلچسپی کے ساتھ پیروی کرتے۔ ایسا بھی ہُوا کہ بعض سنگین قسم کے مقدّمات میں غریب مؤکّلوں کے پاس محنتانہ تو الگ رہا، کورٹ فیس وغیرہ ادا کرنے کی بھی گنجائش نہیں تھی ۔ ایسے موقعوں پر اُنھوں نے اپنی جیب سے مقدّمے کا خرچ برداشت کیا۔

وہ جب بھی حیدرآباد سے کراچی آتے مجھ سے ضرُور ملتے۔ اُن کی یہ وضع آخر دم تک قائم رہی۔ زندگی کے مُعاملات اور مسائل میں وہ بڑے اِعتماد کے ساتھ اپنی رائے دیتے۔ کوئی بھی ذکر کیوں نہ چھڑ جائے خُدا کا نام بار بار لیتے۔ اربابِ تصوّف اور درویشوں سے اُنھیں بڑی عقیدت تھی۔ کسی بزرگ اور اہل اللہ کے بارے میں اُنھیں اِطّلاع مل جاتی تو وہ اپنی پیرانہ سالی کے باوجُود وہاں ضرُور پہنچتے اور اُن کی خدمت میں مؤدّب ہو کر بیٹھتے۔ بعض اوقات تو وہ سماع کیا نماز تک میں شریک ہو جاتے۔ اُن کی عقیدت کا یہ پہلُو بڑا حیرت انگیز تھا۔ اُن کے عقیدے اور ایمان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپُرد ہے۔

مسٹر کل نسلی طور پر ہندُو تھے، مگر اُن کے کردار میں جو خُوبیاں پائی جاتی تھیں، وہ اس زمانے کے بعض پُشتینی مُسلمانوں میں دیکھنے کے لِیے آنکھیں ترستی ہیں۔

ایک بار مَیں نے اُن سے کہا: مشہور انگریزی رسالے Reader's Digest میں "ناقابلِ فراموش" کے عنوان سے مضامین آتے رہتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں آپ پر ایک مقالہ لکھ کر چھپواؤں، معلوم ہُوا کہ وہ خود بھی اِس رسالے کو پابندی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی خُوبیاں واقعی اِس قابل ہیں کہ اُن کا ذکر کیا جائے ــــ اِسی جذبے نے اُن کی موت کے ۵، ۶ سال بعد "انجمن" میں یہ تاثّرات شریک کرنے پر مجبُور کر دِیا۔

جسٹس شیخ دین محمدؒ

جسٹس شیخ دین محمدؒ مرحوم گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ میرے کئی بزرگوں کے شیخ صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ صاحبِ موصوف ذہین تھے، محنتی تھے، فرض شناس تھے۔ وہ ترقّی کرتے کرتے ہائی کورٹ کی ججی کے عُہدۂ جلیلہ تک پہنچ گئے۔ مسجد شہید گنج کے شُہرۂ آفاق مقدّمے کے لیے حکومت نے جن تین ججوں پر مشتمل ڈویژن بنچ بنایا تھا، اُس کے ایک رُکن شیخ دین محمدؒ بھی تھے۔ اِن تین ججوں میں سے دو نے فیصلہ مُسلمانوں کے خلاف کیا، مگر جسٹس دین محمدؒ نے اپنے رُفقاء کی رائے سے اِختلاف کرتے ہُوئے اِختلافی نوٹ لکھا۔ عدل و اِنصاف کے تقدس کو اُنھوں نے زندگی بھر عزیز رکھا اور عدلیہ کو ہمیشہ اِنتظامیہ سے برتر و اعلیٰ سمجھا۔

قانونِ شریعت اور اسلامی تاریخ پر اُن کی نظر وسیع تھی۔ اُن

کے فیصلے اُن کی وسعتِ مُطالعہ اور قانونی بصیرت کے شاہد ہیں۔ مسجد شہید گنج کے مقدّمے کا اختلافی نوٹ پڑھنے سے تعلّق رکھتا ہے۔ اُن کے سینے میں ایک ایسا حسّاس دل تھا، جو مُسلمانوں کے درد سے معمُور تھا۔

قیامِ پاکستان سے کچھ دن قبل میرا ہیڈ کوارٹر بمبئی میں تھا۔ چند دن کی رُخصت پر میں لاہور گیا۔ وہاں سے واپسی پر ٹرین میں جسٹس دین محمدؒ کا ساتھ ہو گیا۔ مَیں نے دریافت کیا؛ کہاں کا قصد ہے؟ فرمایا؛ قائدِ اعظم محمّد علی جناح سے ملنے دہلی جا رہا ہُوں تاکہ اُنھیں رُو در رُو، بالمشافہ بتا سکوں کہ پاکستان اور ہندوستان کی سرحدیں مقرّر کرنے کے لیے ریڈ کلف کی ثالثی کو حکمِ ناطق اور حرفِ آخر سمجھ لینا مُسلمانوں کے لیے اِنتہائی مُضر ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک فرد کے ہاتھ میں مُلک کی تقدیر دے دینا کسی طرح خطرے سے خالی نہیں۔

جسٹس دین محمّد دہلی اُتر گئے۔

لیکن

جب ریڈ کلف ایوارڈ سامنے آیا تو پتہ چلا کہ اِس فرنگی ثالث نے تو جانب داری، ناانصافی اور ہندُو دوستی کی حد کر دی۔ انگریز ہندوستان سے جاتے ہُوئے مسلمانوں پر وار کر گیا۔ خاص طور سے کشمیر کے مسئلے میں پاکستان اور ہندوستان کو اُلجھا گیا۔ جسٹس دین محمّد

کے الفاظ یاد آتے ہیں تو اُن کی رائے کی اصلیت ماننی پڑتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد شیخ صاحب بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ وحدتِ مغربی پاکستان سے قبل وُہ سِندھ کے گورنر تھے اور اُمورِ کشمیر کے وزیر بھی۔ اُن سے ملنے کا اکثر اِتفاق ہوتا رہتا۔ شعر و شاعری سے بڑا گہرا شغف رکھتے تھے۔ خاص طور سے علامہ اِقبالؒ کے مداح، بلکہ شیدائی اور عقیدت مند تھے۔ ایک بار اُن سے مُلاقات ہُوئی تو مَیں نے عرض کیا کہ علامہ کا ایک شعر کئی دن سے زیرِ غور ہے۔ بہُت کچھ سوچا، مگر اس کا مفہوم پُوری طرح سے نہ کھُل سکا۔ اس کے بعد مَیں نے یہ شعر پڑھا ـــــ

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر

کہ ہمیں تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

شیخ صاحب نے یہ شعر سُنتے ہی فوراً کہا۔ مَیں سمجھ گیا ـــــ "طریقِ خانقاہی" نے تمھیں اُلجھن میں ڈال دیا ہے۔ اِس کا مطلب بتائے دیتا ہُوں۔ اِس شعر کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ پھر کوئی اُلجھن یا ابہام ذہن میں نہ رہے گا۔ پھر بولے "طریقِ خانقاہی سے ڈاکٹر صاحب نے دراصل 'جمُود' مُراد لی ہے۔ انگریزی میں اِسے Inertia کہتے ہیں۔"

گھر آکر مَیں نے ڈکشنری دیکھی تو شعر کا مفہوم صاف ہو گیا۔ ذرا سی بھی اُلجھن نہ رہی۔

زندگی اور وفا کرتی تو اُن کے احباب کی اُن سے ایک گراں قدر تصنیف یا تالیف کی توقع بھی پُوری ہو جاتی ۔ شیخ دین محمدؒ مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے، جن کو جاہ و منصب کے لوازم اور کُرسی کی بلندی نے ملّت اور وطن کے درد و غم سے غافل نہیں ہونے دیا۔
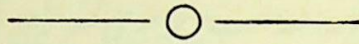
راج گوپال اچاری

دُوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا اور غالباً ۱۹۴۳ئہ یا ۱۹۴۴ئہ کا ذکر ہے۔ جن دنوں میرا مستقر (ہیڈ کوارٹر) دہلی میں تھا اور سرکاری فرائض کی ادائگی کے سلسلے میں مجھے پُورے ہندوستان کا دَورہ کرنا پڑتا تھا۔ اُسی دوران میں مدراس کا ایک ضرُوری سفر نکل آیا۔ مَیں گرانڈ ٹرنک ایکسپریس سے جو اُس زمانے میں دہلی سے سِیدھی مدراس جانے والی ٹرین تھی، روانہ ہو گیا۔ متّحدہ ہندوستان کے ہر گوشے میں فوجی سپاہیوں اور افسروں کی نقل و حرکت زوروں پر تھی، اِس لیے ٹرینوں میں جگہ بڑی مشکل سے مِلتی۔ مُسافروں کو کئی کئی ہفتے پہلے نِشستیں محفوظ (ریزرو) کرانی پڑتیں۔ میرے فرائض کا تعلّق چُونکہ فوج سے تھا، اِس لیے سیٹ مِلنے میں خاص دُشواری پیش نہیں آئی —— جناب عبّاس خلیلی جو حکومتِ پاکستان میں سیکریٹری رہ چکے ہیں اور آج کل ایسٹرن فیڈرل

یُونین اِنشورنس کمپنی لمیٹڈ کے چیئرمین ہیں، میرے ہم سفر تھے۔ دہلی سے روانہ ہو کر دُوسرے دِن وار دھا اسٹیشن پر جب گاڑی پہنچی تو پلیٹ فارم پر مُسافروں کا خاصا ہجُوم تھا۔ یہاں گاڑی آدھ گھنٹے کے قریب ٹھہرتی تھی۔ مَیں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی تو چند کھدّر پوشوں کو جگہ کی تلاش میں سرگرداں پایا۔ اِسٹیشن پر آکر ٹرین میں جگہ نہ ملے تو ایسے عالم میں سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بدحواس سا ہو جاتا ہے۔ اِن کھدّر پوشوں میں ایک صاحب پر جو میری نظر پڑی تو اَخبارات میں بار بار دیکھی ہُوئی تصوِیر مجھے یاد دلا رہی تھی کہ یہ تو راج گوپال اچاری ہیں۔ مَیں کمپارٹمنٹ سے باہر آیا اور اُن سے مُخاطب ہُوا ــــــ

"آپ اِس کمپارٹمنٹ میں تشریف لے آئیں!"

راجہ جی نے میری طرف بغور دیکھتے ہُوئے جواب دِیا ــــــ

"آپ کتنے مُسافر اِس میں سفر کر رہے ہیں؟"

مَیں نے کہا ــــ چار۔

کہنے لگے ــــ

"پھر پانچویں کی گنجائش کہاں ہے!"

مَیں نے جواب دیا ــــ

"آپ فکر نہ کریں۔ مَیں رات کے وقت اپنا بستر نیچے لگا لُوں گا۔ آپ اندر تشریف لے آئیں!"

راج گوپال اچاری اِس پر مُسکرائے۔ اِس مُسکراہٹ میں جذبۂ تشکّر کی بھی آمیزش تھی۔

اُن کے ڈبّے میں داخل ہونے کے چند منٹ بعد گاڑی روانہ ہوگئی اور راقِمُ الحُروف اور عبّاس خلیلی صاحب اُن سے مختلف مسائل پر گفتگو کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب مُسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کش مکش زوروں پر تھی۔ قائدِ اعظمؒ اور مہاتما گاندھی کی مُلاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ راج گوپال اچاری کی روِش معتدل اور صلح کُن تھی۔ اِس حقیقت کو غالباً وُہ پا چُکے تھے کہ مُسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ مُتحدہ ہندوستان کی تقسیم مُقدّر ہو چکی ہے۔

راجہ جی مدراس کے وزیرِ اعلیٰ تھے تو عبّاس خلیلی اُن کے ماتحت کام کر چکے تھے، اِس لیے اُن کے اور خلیلی صاحب کے درمیان تکلّف اور اجنبیت حائل نہ تھی۔ مَیں اس زمانے میں سگریٹ کیا پیتا تھا، یُوں کہیے، دھواں اُڑاتا تھا۔ ایک سگریٹ ختم ہُوئی کہ دُوسری سگرٹ فوراً اُنگلیوں میں آگئی۔ مشہور ضرب المثل ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے، مگر مَیں سگریٹ سے سگریٹ جلانے کے فن میں طاق تھا۔ راجہ جی میری سگریٹ نوشی کو بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ اُن سے ضبط نہ ہو سکا۔ وُہ بول پڑے ——

"سگریٹ پیتے ہُوئے کبھی آپ نے یہ بھی سوچا

ہے کہ اِنسان مادرِ وطن (Mother Earth) سے جو کچھ
حاصل کرتا ہے، اُس کے عوض کچھ نہ کچھ کسی صورت میں
واپس بھی کرتا ہے۔ صرف سگریٹ نوشی ایسی چیز ہے جس
میں اُس کو کچھ بھی واپس نہیں مِلتا۔"

یہ فلسفیانہ نکتہ سُن کر مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ اِس پر جتنا بھی غور کیا، اِن جُملوں کی معنوی صداقت کا قائل ہونا پڑا۔ مَیں نے اثنائے گفتگو میں اُن سے سوال کیا کہ آپ انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کی اِتنی تیز اور عاجلانہ کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں اُن کا کچھ عرصہ اور اِس مُلک میں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے؟ راجہ جی اپنی عینک کی کمانی چھُوتے ہُوئے مُسکرائے اور بڑے وقار و متانت کے ساتھ بولنے لگے ــــــ

"آزادی کا مفہوم کِس قدر اہم ہے۔ انگریزی
تسلّط نے ہمارے اخلاق و کردار پر کیسے ناخوشگوار
اثرات ڈالے ہیں۔ برطانوی استعمار کا جُوا اپنی گردن
سے اُتارے بغیر ہم اپنی مخصُوص تہذیبی روایات کے
مطابق ترقّی نہیں کر سکتے۔ دُنیا میں کالونی ازم کا مستقبل
تاریک ہو چکا ہے اور جو لوگ اسے برقرار رکھنے کے لیے
ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، وہ آخرِ کار ناکام اور پشیمان

ہوں گے اور ....“

ابھی اُن کی گفتگو کا سِلسلہ جاری تھا کہ نماز کا وقت ہوگیا۔ مَیں اپنی طرف سے اب سوال وجواب کے لیے تیار نہ تھا کہ وقت خُود مؤذّن بن کر خاموشی اذان دے رہا تھا۔ میں نماز میں مشغول ہوگیا۔

میرے اسٹاف کے چند آدمی برابر والے سرونٹ کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہے تھے اور ایک بُوڑھا انگریز کرنل قریب کے ڈبّے میں سوار تھا۔ اُس کے کسی مُلازم نے شکایت کی کہ میرے اسٹاف کے آدمی اُسے اِس کمپارٹمنٹ میں بیٹھنے سے روک رہے ہیں۔ ملازم کی زبان سے یہ سُننا تھا کہ وُہ کرنل غصّے کے مارے لال بھبُوکا ہوگیا۔ اِسی عالمِ غیظ و غضب میں ڈبّے سے باہر آیا اور نوکروں کے درجے میں آکر میرے اسٹاف والوں کو ٹھوکریں مار مار کر باہر نکالنا شرُوع کر دِیا۔ وہ تنہا انگریز کرنل اور اِتنے بہُت سے ہندوستانی، مگر اُس کے حقارت آمیز برتاؤ اور فرعَونیت کے خلاف بولنے کی کسی کو ہمّت نہیں ہُوئی —— یہ سب انگریز کے اقبال کے کرِشمے تھے۔

میں اُس وقت فوج میں میجر تھا اور سرکاری فرائض کے سِلسلے میں سفر کر رہا تھا، اِس لیے اِس واقعے کی اہمیّت اور زیادہ ہو گئی۔ اِسٹیشن پر اچھّا خاصا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ میرا عملہ شکایت لے کر میرے پاس آیا کہ ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے۔ مَیں نے اِشارے

سے کہا کہ واپس جاکر اپنی جگہ بیٹھ جاؤ ۔ اِتنے میں گاڑی روانہ ہوگئی۔
میں نے جب نماز ختم کر لی تو راج گوپال اچاریہ نے، جو اس واقعے کے
عینی شاہد تھے، میری طرف خاص نظروں سے دیکھا۔ پھر وہ مجھ سے مُخاطب
ہُوئے ـــــ

"یہی وہ انگریز ہیں، جن کو تم اِس مُلک میں رکھنا
پسند کرتے ہو؟"

اُن کا یہ سوال نہایت برمحل تھا۔

مَیں اپنی ندامت چُھپانے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جوانی کا عالم، فوج کی عُہدیداری۔ میرے جسم میں غُصّے کی
بجلیاں سی مچلنے لگیں۔ میرے عملے نے جو شکایت کی تھی، اُس کا احساس
ہر لمحہ شدید ہوتا جا رہا تھا۔ مَیں اِس اِنتظار میں تھا کہ گاڑی رُکے تو اِس
کرنل سے دو دو ہاتھ اور دو دو باتیں ہوں۔

اگلے اِسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ مَیں اپنے ڈبّے سے فوراً نکل کر اِس
انگریز کرنل کے کمپارٹمنٹ کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور اُس کو مُخاطب
کر کے کہا۔

"کرنل! باہر نِکلو، ڈبّے سے باہر آؤ، تاکہ مَیں
تمھاری اِس بدتمیزی کا جواب دے سکوں"۔

مَیں اپنے قد و قامت اور جسامت کے لحاظ سے کافی مضبُوط تھا۔

اُدھر وُہ میرا مدِمُقابل کرنل بُوڑھا اور کمزور۔ انگریز بڑے موقع شناس ہوتے ہیں اور مصلحت اندیش بھی۔ میرے مُنہ سے گالیاں سُن کر وُہ طیش میں نہ آیا اپنی سیٹ پر ضبط کیے بیٹھا رہا۔

اِسٹیشن پر لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ مَیں تماشا بنا ہُوا تھا۔ مُسافروں کو سب سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہو رہی تھی کہ ایک مُسلمان افسر انگریز کرنل کو اِس طرح ملاّحیاں سُنا رہا ہے اور کرنل نے چُپ سادھ لی ہے۔ ایک حرف زبان سے نہیں نکالتا۔

جب گاڑی چلنے لگی اور مَیں اپنے ڈبّے کی طرف بڑھا تو وہ کرنل مجھے غُصّے کی نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا ــــــ

"تُم نے مجھے کِتنی گالیاں دی ہیں۔ صُبح کے وقت تم سے نمٹوں گا!"

راج گوپال اچاریہ نے بھی یہ فقرہ سُن لیا اور مجھ سے بولے:

"مَیں اپنے تجربہ کی بناء پر کہتا ہُوں کہ صُبح یہ تمھارے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ رات کی تاریکی میں آدمی بعض ایسی حماقتیں کر بیٹھتا ہے، جن کا دِن کے وقت وُہ سامنا تو کیا، تصوّر کرنے سے بھی کتراتا ہے۔"

رات کے وقت مَیں نے اپنا بِستر نیچے بچھا لیا۔ راجہ جی میری سِیٹ پر دراز ہو گئے۔ صُبح ہوتے ہی مَیں اُس انگریز کرنل کے ڈبّے کے

سامنے جا کھڑا ہُوا۔ میری رگوں کا گرم خُون اُس کا چیلنج قبول کر چُکا تھا۔ مَیں اُس کے باہر آنے کا اِنتظار کرتا رہا۔ مگر اُس نے باہر آنا تو درکنار، کھڑکی سے جھانک کر بھی نہ دیکھا۔ مدراس پہنچنے تک مَیں نے کئی اسٹیشنوں پر اُتر کر اُسے دیکھا، مگر وہ اپنے ڈبّے میں مقیّد بیٹھا رہا۔

مدراس پہنچ کر میرے رفیقِ سفر راج گوپال اچاریہ نے رُخصت ہوتے ہُوئے مُجھ سے مُخاطب ہو کر جو فقرہ کہا، وہ مجھے آج تک یاد ہے۔۔۔

"مَیں نے سُنا تھا کہ شمالی ہند کے باشندے بہُت خلیق اور مہمان نواز ہوتے ہیں۔ آپ سے مِل کر اِس کا تجربہ بھی ہو گیا۔"

راجہ جی کی یہ بات سُن کر مجھے اندازہ ہُوا ـــــ بڑے لوگ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اِس طرح کِیا کرتے ہیں۔ کیونکہ ـــــ

"بڑے آدمی کی پہچان ہی یہ ہے کہ وُہ چھوٹے آدمیوں کو بڑا بنائے اور چھوٹے آدمی کی پہچان یہ کہ بڑوں کو چھوٹا کرے۔"
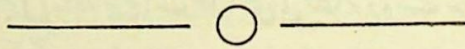
حکیم احمد شجاع

حکیم صاحب کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں ؟ اُن کی کس کس خُوبی کا ذکر کیا جائے ۔ انشاء پردازی میں مشّاق، بلند پایہ ادیب، خوش گو شاعر، مشہور ناول نگار اور صاحبِ طرز ڈرامہ نویس ! اتنی بہت سی خُوبیاں ایک شخصیّت میں کم ہی جمع ہوتی ہیں ۔

حکیم امین الدّین مرحُوم کے تذکرے میں حکیم احمد شجاع سے اپنے تعلّق کو بیان کر چکا ہوں اور "روزگارِ فقیر"، جلد دوم میں حکیم صاحب موصُوف اور علّامہ اقبالؒ کے مراسمِ دیرینہ پر بھی خاصی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال چُکا ہوں ۔ یہاں حکیم صاحب کے بارے میں بعض ذاتی تاثّرات بیان کرنے کی جُرأت کر رہا ہُوں ۔ اور یہ جُرأت خُود اُنھی کی عطا کردہ ہے کہ سن رسیدہ، واجب الاحترام بزرگ ہونے کے باوجود ان کے اور میرے درمیان جب بھی کسی موضُوع پر گفتگو ہوتی ہے تو موصُوف اپنے برابر کے دوستوں کی

طرح بے تکلفانہ اظہارِ خیال فرماتے ہیں اور بزرگی و خوردی کے غیر ضروری حجابات اُٹھا دیتے ہیں۔ ایسی رنگا رنگ اور باغ و بہار ہستیاں روز روز کہاں پیدا ہوتی ہیں۔

حکیم احمد شجاع ابھی کم سن ہی تھے کہ سایۂ پدری اُن کے سر سے اُٹھ گیا اور آٹھ نو سال کی عُمر میں وہ یتیم ہو گئے۔ اُن کے والد شجاع الدّین صاحب مشہور اور کامیاب طبیب تھے۔ رشتے کے لحاظ سے وُہ حکیم امین الدین کے والد حکیم حسام الدّین کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ گویا حکیم امینُ الدّین اور حکیم احمد شجاع آپس میں چچازاد بھائی تھے۔ شجاعُ الدّین صاحب کا انتقال ہُوا تو حکیم امینُ الدّین نے اس یتیم مگر ہونہار بچّے کو اپنی نگرانی اور سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

حکیم امینُ الدّین صاحب کے دو بیٹیاں تھیں، لیکن بیٹا کوئی نہ تھا۔ حکیم احمد شجاع کو اُنھوں نے بالکل اپنی اولاد کی طرح پالا اور اُن کی تعلیم و تربیت پر پُوری توجّہ صرف کی۔

حکیم صاحب اوائل عُمری سے ذہین، ہونہار اور پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے۔ اس ذہانت و لیاقت کو اچھّی تربیت ملی تو جوہرِ قابل اور نکھر گیا۔ بچپن کی تربیت پر بچّے کے روشن اور تاریک مستقبل کے ہونے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد وُہ علی گڑھ چلے گئے اور جب وہاں سے بی۔ اے پاس کر کے لوٹے، تو اُن کی صلاحیتیں اُجاگر ہونے لگیں۔ قریبی

رشتے داری کے سبب وُہ ہمارے یہاں اکثر آتے جاتے رہتے۔ مَیں چائے اور کھانے میں انھیں عمُوماً اپنے بزرگوں کے ساتھ شریک اور ہم نشین دیکھتا۔ مَیں کوئی بارہ تیرہ سال کا ہُوں گا، جب میں نے پہلی بار اُنھیں اپنے والد کو اُن کا اپنا لکھا ہُوا ڈرامہ سُناتے ہُوئے دیکھا۔ اُس کم سنی میں اتنی سمجھ کہاں تھی جو میں اُن کے ڈرامے کی خوبیوں کا اندازہ کر سکتا۔ اب سوچتا ہُوں تو یہ نکتے ذہن میں آتے ہیں کہ حکیم احمد شجاع صاحب ڈرامہ سُناتے وقت ہر کردار کی اداکاری کس فطری انداز میں کرتے جاتے تھے۔ صحتِ تلفّظ، جوشِ خطابت اور چشم و ابرُو کے اشاروں سے مفہوم کا اظہار؛ یہ خوبیاں ایک باکمال ڈرامہ نویس ہی کو مُیسّر آسکتی ہیں۔ میرا شعُور جیسے جیسے پختہ ہوتا گیا، حکیم صاحب کی شخصیّت کے جوہر میرے لوحِ ذہن و فکر پر ابھرتے چلے گئے۔

برطانوی حکومت نے جمہُوری آزادی کی جب پہلی قسط مرکزی اسمبلی اور صُوبائی کونسلوں کی صُورت میں دی تو پنجاب میں بھی لیجسلیٹو کونسل کا قیام عمل میں آیا اور کونسل کے اجلاس کے لیے ایک ایسے لائق اور ماہر مترجم کی ضرورت لاحق ہُوئی، جو کونسل میں کی جانے والی انگریزی تقریروں کا ترجمہ ہاتھ کے ہاتھ شُستہ اردو میں کر سکے۔ یہ بڑی نازک اور اہم ذمّہ داری تھی اور ایسا کام تھا، جس کے لیے غیر معمُولی مہارت اور قابلیّت کی ضرورت تھی۔ ساتھ ہی ذہانت کی بھی۔ اس پوسٹ کے لیے حکومت

کی طرف سے اخباروں میں اشتہارات دیے گئے۔ بے شمار درخواستیں آئیں۔ بڑے پیمانے پر انٹرویو لیے گئے، لیکن انٹرویو میں نگاہِ انتخاب حکیم صاحب ہی پر آکر ٹھہری۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مُسلمانوں کے علاوہ سینکڑوں ہندو سِکھ اور بعض عیسائی اُمیدوار بھی اِس انتخاب میں شریک تھے۔ ذہانت و قابلیّت کا یہ پہلا معرکہ تھا، جسے حکیم احمد شجاع نے سر کیا۔ کونسل میں اب اُن کی یہ ڈیوٹی تھی کہ کوئی انگریز ممبر اپنی تقریر ختم کرتا اور حکیم صاحب پوری تقریر کا ترجمہ اردو میں فرفر سنا دیتے۔ اُن کے ترجمے کے بارے میں کسی کی زبان سے کوئی شکایت نہیں سنی گئی۔

اِسی طرح ڈرامہ لکھنے اور اسٹیج کرنے میں آغا حشر کے بعد سب سے زیادہ شہرت اُنھی کو ملی۔ دُنیائے علم و ادب میں اُن کی "خُوں بہا" جیسی تصانیف نے دُھوم مچا دی۔ اُن کی شعر گوئی کا یہ عالم رہا ہے کہ کسی واقعے یا کیفیّت سے متاثّر ہُوئے اور اشعار خود بخود موزوں ہوتے چلے گئے۔ ساحرؔ تخلّص فرماتے ہیں اور ڈرامے کی طرح شاعری میں بھی جادو جگاتے ہیں۔

سر فضل حسین کا انتقال ہُوا تو یہ خبر آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق مرحُوم کی کوٹھی پر پہنچنے لگے۔ حکیم صاحب بھی تشریف لے گئے۔ موٹر سے اُترتے ہی سر فضل حسین کے صاحبزادے میاں نسیم حسن سے ملے، پُرسا دیا۔ پھر مرحُوم کی خُوبیوں کا ذکر کرتے ہُوئے ارتجالاً یہ شعر پڑھا:

مِٹنے کو مٹ چکی تھی مسلماں کی آبرُو | پر تیری موت نے تو ڈبو دی ہی رہی

پنجاب میں مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی زبوں حالی قدم قدم پر اچھے رہنماؤں اور قوم کے مخلص بہی خواہوں کو آواز دے رہی تھی۔ ایسے وقت میں مسلمانوں کا ایک با اثر اونچے درجے کی شخصیت سے محروم ہو جانا غیر معمولی سانحہ تھا۔ حکیم صاحب نے اپنے شعر میں اسی کیفیت کو انتہائی سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر حکومتِ ہند کو عوام سے قرض لینا پڑا۔ انگریزوں نے اپنے دورِ فرماں روائی میں غالباً پہلی بار پبلک سے قرضہ حاصل کرنے کی اپیل کی تھی۔ حکومت نے اعلان کیا کہ جو کوئی قرضے کے اشتہار کے لیے مختصر اور مؤثر عبارت مرتّب کرے گا، اُسے پانچ سو روپے کا انعام دیا جائے گا۔ اس اعلان کا اخباروں میں آنا تھا کہ بہت سے اہلِ قلم عبارت آرائی اور قلم کاری میں مصروف ہو گئے۔ سینکڑوں "عبارتیں" لکھ کر بھیجی گئیں، مگر جس "عبارت" نے انعام حاصل کیا وہ حکیم احمد شجاع کی مرہونِ قلم تھی۔ اُن کی لکھی ہوئی عبارت یہ تھی ——

"قرض اور فرض میں صرف
ایک نقطہ کا فرق ہے۔
آپ کے لیے
وہ بھی نہیں!"

اس عبارت کو حکومت نے اپنے اشتہار کا عنوان بنایا۔ وسیع

پیمانے پر سارے مُلک میں اشاعت ہُوئی۔ جو کوئی اس اشتہار کو پڑھتا، سرکاری قرض کے حُسنِ طلب کی بے ساختہ داد دیتا۔

مُتحدہ ہندوستان میں فلم سازی سے پہلا دَور "تھیئٹر" کا دَور ہے۔ اُس زمانے کی یہ باتیں آج کانوں میں گُونج رہی ہیں کہ فلاں تھیئٹر کمپنی کا فلاں کھیل اس قدر مقبُول ہُوا کہ سقّوں نے اپنی مشکیں بیچ کر کھیل دیکھا۔ ہاں! تو اُسی زمانے میں دادا بھائی نام کا ایک پارسی اپنی تھیئٹر کمپنی لے کر لاہور آیا۔ لوگوں کی دلچسپی کے مدِ نظر اُس نے شہنشاہ اکبر کے متعلق ایک ڈرامہ اسٹیج کرنا چاہا۔ ریہرسل شروع ہُوئی۔ اس کے بعد دُوسرے مراحل طے ہوئے۔ یہاں تک کہ ڈرامہ قریب قریب مکمل ہو گیا۔ مگر ایک "سین" ایسا تھا کہ تھیئٹر کمپنی کے تمام دماغ سوچتے سوچتے تھک گئے، مگر بات نہ بنی۔ اس سین میں یہ دکھانا تھا کہ جلال الدّین اکبر کا انتہائی شان و شوکت اور شاہانہ عظمت و جلال کے ساتھ دربارِ شاہی میں نزُولِ اجلال ہو رہا ہے۔ اس اہم اور عظیم منظر کے لیے جاہ و جلال اور آدابِ شاہی اور موسیقی کی دُھنوں میں مُطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرُورت تھی، یعنی ایسے ماحول کی تخلیق درکار تھی، جیسے مغلیہ دربار میں سچ مچ شہنشاہ اکبر داخل ہو رہا ہے۔ شاگرد پیشہ رنگ برنگی وَردی پہنے اور چوبدار عصا ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں۔ اُمراء، وُزراء اور منصب دار جُھک جُھک کر آداب بجا لا رہے ہیں۔ اس پُر اجلال منظر کے ساتھ روشن چوکی شہنانہ کی گت بجا رہی ہے اور تمام آلاتِ طرب و

موسیقی ـــــ طنبورہ، بربط وطاؤس، نفیری، جھانجھ، مردنگ وغیرہ ـــــ اِسی لَے میں لَے مِلا رہے ہیں۔

کمپنی کا مالک، ڈائریکٹر، ڈرامہ نویس، دُوسرے فن کار اور مُشیر سر مار کر رہ گئے۔ مگر اس منظر کے شایانِ شان اہتمام نہ ہوسکا۔ آخر مجبُور ہوکر اُنھوں نے حکیم احمدؔ شجاع سے درخواست کی۔ حکیم صاحب موصُوف نے منظر کی اہمیّت اور اُس کے لوازم پر غَور کرنے کے بعد اُسی وقت سَیٹ پر پہنچ کر تھیئٹر کے عملے کو ہدایات دینا شرُوع کر دیں۔ خود ہی ڈائیلاگ تجویز کیے اور اداکاری کے ساتھ اُن مکالموں کو بھی بولتے گئے۔ ساتھ ہی پس منظر کی موسیقی کی دُھنیں اور بول بھی کھڑے کھڑے مُرتّب کر ڈالے۔ یہ بول مجھے اب تک یاد ہیں، جیسے کل کی بات ہو۔ آپ بھی لُطف اُٹھائیے:

قائم یہ راج رہے
دائم یہ تاج رہے
دُشمن ہو چُور چُور
ڈنکا ہو دُور دُور
عالم میں تیری سرکار کا

حکیم صاحب نے اپنی مخصُوص دل نشیں اور اثر انگیز آواز میں یہ بول اِس طرح ادا کیے کہ سچ مُچ دربارِ اکبری کا سماں بندھ گیا اور ساری فضا شاہانہ عظمت اور نغمگی کی مدھر تان سے گونج اُٹھی۔

دادا بھائی اور اُن کا اسٹاف حیران تھا کہ جس منظر کے لیے وہ اتنے دنوں سے مغز مار رہے تھے حکیم صاحب نے تھوڑی سی دیر میں اُسے سیٹ کر دیا۔

اگرچہ ۳۰، ۳۵ سال گزر چکے ہیں، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اس زمانے میں "کاروانِ حیات" کے نام سے ایک فلمی کہانی بھی لکھی تھی۔ یہ کہانی جب فلمائی گئی تو اسے سارے ہندوستان میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خانہ بدوش قبیلے کی اس کہانی کے مکالمے اور گیت بھی انھوں نے ہی لکھے تھے۔ یہ گیت اور نغمے اس قدر مقبول ہوئے کہ فلم کی نمائش کے کچھ عرصے بعد انھیں ملک کے ہر خاص و عام باشندے کی زبان پر سُنا گیا—— ان میں سے ایک گیت کے یہ بند بھی مجھے اب تک یاد ہیں——

ہر صبح سفر ہر شام سفر
اِس دُنیا کا ہے نام سفر
اِس زندگی کا انجام سفر
پردیسی پریت کہاں جانے

دل جنگل ہی میں بہلتا ہے
یہاں حُسن پہ عشق مچلتا ہے
یہاں پریم کا ساغر چلتا ہے
پردیسی پریت کہاں جانے

کوئی پریت کی رِیت بتا دو ہمیں
کوئی من کا میت مِلا دو ہمیں
کوئی ایسا گیت سُنا دو ہمیں
کِھل جائے جس سے دِل کی کلی
یہاں دل کی کلی تو کبھی نہ کِھلی

یہ سب شہروں کے دھندے ہیں
یہ حرص و ہوس کے پھندے ہیں
ہم تو سیلانی بندے ہیں
ہم پریت کی رِیت کہاں جانیں

حکیم صاحب موصُوف کو قدرت نے دُوسری صلاحیّتوں کے ساتھ جو آواز اور لہجہ بخشا ہے، وہ ڈائیلاگ کی ادائیگی اور ریڈیو نشریات کے لیے اِنتہائی موزُوں ہے۔ اِس ستّر سال کے سن میں بھی وہ گفتگو کرتے کرتے جب جوش میں آجاتے ہیں تو اُن کی آواز، لہجہ اور خطابت کا انداز مسحُور کُن سماں پیدا کر دیتا ہے اور سامع یا مخاطب کا جی چاہتا ہے کہ وہ حکیم صاحب کی شگفتہ اور دل آویز گفتگو سُنتا رہے۔

وہ اِس قدر بذلہ سنج اور خوش طبع واقع ہوئے ہیں کہ موضُوعِ گفتگو

کوئی بھی ہو، وہ اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ اور لطف کی بات ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک بار مجھ سے فرمانے لگے: —

"وحید میاں! میں نے کئی سال سے دعوتوں میں آنا جانا ترک کر دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جو حضرات کھانے پر بلاتے ہیں، وہ لنچ یا ڈنر کا وقت بھی مقرر کر دیتے ہیں۔ مثلاً لنچ کا وقت ایک بجے، ڈنر کا آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے۔ میں پوچھتا ہوں۔ خدا کے ان نیک بندوں کو میرے کھانے کا وقت مقرر کرنے کا کیا حق ہے اور وہ یہ کس طرح فرض کر لیتے ہیں کہ مجھے دن میں ایک بجے اور رات کو آٹھ بجے ہی بھوک لگے گی!"

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ حکیم صاحب گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور لوگوں کے یہاں آنا جانا بند کر دیا ہے۔ اُن کی شخصیت قدیم بزرگوں کے اخلاص و محبّت اور شرافت و وضع داری کا نمونہ اور یادگار ہے۔ غریب و امیر دوستوں اور عزیزوں کے یہاں آنا جانا اور خیر و خبر لیتے رہنا اب بھی اُن کے معمولات میں داخل ہے۔

خاندان یا دوسری جگہوں پر محرّم کی مجالس میں بصد شوق و احترام شرکت فرماتے ہیں۔ عالمانہ تقریریں کرتے ہیں اور اپنے لکھے ہوئے مرثیے پڑھتے ہیں۔ خدا نے نہایت بلند اور پُراثر ترنّم دیا ہے۔ جب عشقِ حسینؑ

میں ڈُوب کر مرثیہ پڑھتے ہیں۔ اپنے ساتھ سامعین کو بھی بے خُود بنا دیتے ہیں۔ اُن کے ایک مرثیے کے چند اشعار، جو الَم، سِتَم اور خم کے قافیوں میں کہے گئے ہیں، درج ذیل کرتا ہُوں :——

دُنیا پہ ہوتے آئے ہیں ظُلم و سِتَم بہُت
اِنسان نے سہے ہیں زمانے کے غَم بہُت

قلبِ بشر رہا ہے رہینِ الَم بہُت
پُشتِ جہاں رہی ہے مصائب سے خم بہُت

پھر فرمایا ہے ——

لیکن حدیثِ معرکۂ کربلا نہ پُوچھ
اندازۂ مصیبتِ آلِ عبا نہ پُوچھ

آپ نے غور فرمایا ہو گا کہ حکیم صاحب نے اس مصرعے میں ——

پُشتِ جہاں رہی ہے مصائب سے خم بہُت

اِنسانی تاریخ کی ہزاروں سالہ تلخ حقیقت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

حکیم احمد شجاع کے گلشنِ حیات میں اللہ تعالیٰ نے دُوسری شادی کے بعد دو پھُول کھلائے۔ ایک لڑکا انور کمال اور دوسری لڑکی نور جہاں۔ دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت اعلیٰ معیار پر ہُوئی۔ اُن کی صاحبزادی کی شادی اب سے کوئی ۲۳ سال قبل سردار سکندر حیات خان وزیرِ اعظم پنجاب کے فرزند عظمت حیات خاں

سے ہُوئی تھی۔ سردار سکندر حیات خان مرحوم سے حکیم صاحب کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ مگر رِشتہ مانگنے کے لیے اُنھوں نے ذاتی تعلقات اور دوستی کا اِستعمال پسند نہ کیا، بلکہ جب وُہ لڑکی کے اِنتخاب کے مُعاملے میں اپنی بیگم کے ہم خیال ہُوئے تو ٹھیک اس رواج اور اصُول کے مُطابق کہ لڑکے والوں کو لڑکی والوں کے ہاں جانا چاہیئے۔ بنفسِ نفیس حکیم صاحب کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے۔ یہ بڑا عجیب وقت تھا۔ دوستی کو رِشتے داری میں تبدیل کرنا مقصُود تھا اور وُہ بھی لڑکی کے ذرِیعے۔ لڑکی قُدرت کا ایسا عطِیّہ ہے کہ جب اِس کا کوئی مُعاملہ درپیش ہو تو ماں، باپ اور بھائی بڑے جذباتی انداز میں سوچنے لگتے ہیں۔ لڑکی والا ہونا تو سراسر ایک نازک ذمّہ داری ہے۔ لڑکی غرِیب کی ہو یا امیر کی، سب ہی کو یکساں طور پر عزِیز ہوتی ہے اور سب کی تمنّا یہی ہوتی ہے کہ اُس کا آئندہ گھر جنّت کا نمُونہ ہو۔ بہرحال جب یہ دونوں دوست اکٹھے ہُوئے تو سردار سکندر حیات خان نے تھوڑے سے توقّف کے بعد کہا ــــــ

"احمد شجاع! آج مَیں تُمھارے پاس اِس لیے آیا ہُوں کہ مَیں نے اپنی ایک لڑکی پرورِش کے لِیے تُمھارے سپُرد کی تھی۔ مُجھے معلُوم ہُوا ہے کہ خُدا کے کرم سے اب اُس کی پرورِش مکمّل ہو چکی ہے لہٰذا اب میری بچّی مجُھے واپس دے دو۔"

حکیم صاحب سردار سکندر حیات خان کے اِس حُسنِ طلب کو فوراً سمجھ گئے۔ چند لمحے خاموش رہے، جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہوں۔ بیٹی کے رشتے کا نازک مُعاملہ تھا۔ پھر بڑی متانت سے جواب دیا ـــــ

"سردار صاحب! آپ کی مانگ اور ارشاد کے مُطابق رشتہ تو قائم ہوگیا، لیکن دوستی آج سے ختم ہوگئی!"

بیاہ شادی اور پیغام سلام کا یہ مُعاملہ کِس وقار اور خوبصُورتی کے ساتھ طرفین کے درمیان طے پایا۔

حکیم صاحب کی شخصیت کے متعلق اِن محدُود صفحات میں تاثرات قلمبند کرنا مُمکن نہیں۔ لیکن اِن سے اُن کی باغ و بہار طبیعت اور خُداداد ذہانت کی بعض جھلکیاں ضرور نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اُن کی ذات قدیم جدید تہذیب کا وہ سنگم ہے، جس سے نئے اور پُرانے سبھی لوگ بقدرِ ذوق اِستفادہ کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن کی عُمر میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!

○

سیّدہ محبُوب بیگم

فقیر سیّد افتخار الدّین مرحُوم کی تین لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی میری والدہ، اُن سے چھوٹی سیّدہ مبارک بیگم، جن کا ذکر سیّد مراتب علی مرحُوم کے واقعات میں آچکا ہے اور سب سے چھوٹی سیّدہ محبُوب بیگم، جن کا ذکر اِس "انجمن" کو زینت بھی دے گا اور پاکیزگی بھی۔

سیّدہ محبُوب بیگم کا ذکر مَیں اِس بناء پر نہیں کر رہا ہوں کہ وُہ میری خالہ ہیں اور ہر بھانجے کو اپنی خالہ کا اِحترام اور تعریف ہی کرنی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ذات گُوناگوں خُوبیوں کا مجمُوعہ ہے اور میں اُن کا ذکر چھیڑ کر در اصل نیکی اور خیر و برکت کی داستان دُہرا رہا ہُوں۔ اُن کے کردار و سیرت کی سب سے نمایاں خصُوصیّت یہ ہے کہ اُن میں دُوسروں کی مدد اور دستگیری کرنے کا بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ ضرُورت اور مصیبت کے وقت لوگوں کی خدمت کرنا اُن

کے نزدیک ایک ایسا فریضہ ہے جو عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ اِن صفات کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیّت نے انھیں اولاد کی نعمت سے محرُوم رکھا۔ اِس طرح وُہ محبّت جو اُن کی اپنی اولاد کے کام آتی، دُوسروں پر صرف ہونے لگی۔ ہم پانچوں بھائیوں اور ایک بہن کی پرورش اور نگہداشت کی ذمّہ داری اُنھوں نے قبُول کر کے میری والدہ کو اِس جھمیلے سے آزاد کر دیا۔ اِس طرح سیّد مراتب علی مرحُوم کے بچّے جو اُن کی بہن کی اولاد تھے، اُن کی پرورش کا بارِ گراں بھی اُنھوں نے اپنے خوددار شانوں پر لے لیا اور اُن چار بھائیوں اور پانچ بہنوں نے اُنھی کے سایۂ شفقت میں پرورش پائی۔ اِتنے بہُت سے بچّوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت اور وہ اکیلی جان۔ ان کی غذا، لباس، آرام و آسائش اور علاج معالجے کا بندوبست اور ان کے لیے فکرمندی۔ اِن تمام ذمّہ داریوں کے ہجوم میں وہ اِتنا وقت ضرور نکال لیتیں کہ بیمار رشتہ داروں کے یہاں جا کر عیادت کرتیں، اور کسی کے یہاں کوئی غمی ہو جاتی تو تعزیت کا فرض بھی ضرور انجام دیتیں۔ اُن کا یہ معمُول آج تک قائم ہے۔

آج کل تعلیم کا عام رواج ہے۔ اِس کے لیے ہر طرح کی سہولتیں میسّر ہیں۔ محلّہ محلّہ اسکول قائم ہیں، مگر میری خالہ نے جب ہوش سنبھالا ہے تو اُن دنوں درس و تدریس اور تعلیم کے یہ ذرائع کم یاب بلکہ قریب قریب نایید تھے۔ پھر انھوں نے شریف گھرانوں کے رواج کے مطابق

صرف گھریلو طور پر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ لیکن یہ تعلیم و تربیت اس قدر جامع اور ہمہ گیر تھی کہ سیّدہ محبوب بیگم کی شخصیت اپنی جگہ حکمت و دانش کا ایک دبستان معلوم ہوتی ہے۔ کیسے کیسے نازک اور اہم مسئلوں کی وہ ذرا سی دیر میں گرہ کشائی کر دیتی ہیں۔ اُن کی رائے کس قدر معقول اور وزنی ہوتی ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ ہمارے گھرانے کی مُشیرِ اعلیٰ (Family Advisor) ہیں۔ اُن کا خط کس قدر شُستہ، رواں اور پختہ ہے کم از کم میں نے کسی خاتون کے خط میں اتنی پُختگی نہیں دیکھی۔ یہ دلیل ہے اُن کی زندگی کے خود نستعلیق ہونے کی۔

مقدّر کی بات کہ سیّد مراتب علی کی دُوسری لڑکی جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ یہ بچّی اپنی بدنصیبی پر اکثر روتی رہتی اور مال و دولت کی فراوانی اور ہر طرح کے آرام و راحت کے ہجوم میں بھی اُس کے دل کو قرار نہ آتا۔ بیوگی اپنی جگہ مستقل غم ہے۔ ماموں مراتب علی صاحب کو اپنی اولاد سے بڑی محبّت تھی۔ ایک دن وہ خالہ محبُوب بیگم کے پاس، جو میری والدہ کے ہمراہ ایک ہی کوٹھی میں رہتی ہیں، آئے اور کہنے لگے:

"بہن! فاخرہ کو سمجھائیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس پر بڑا سانحہ گزرا ہے، لیکن ہر وقت کا رونا دھونا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔"

خالہ نے فوراً جواب دیا ——

"بھائی صاحب! بہتر ہے کہ وُہ روئے اور آپ ہنسیں۔ نہ یہ کہ وُہ ہنسے اور آپ روئیں۔"

ایک بیوہ لڑکی کی زندگی، اُس کے غم اور مستقبل کے بارے میں، یہ نصیحت اور حکمت آمیز تصوّر بابِ اخلاق کا کس قدر روشن عنوان ہے!

اُنھیں اپنے عزیز بچّوں سے کس درجہ لگاؤ اور والہانہ محبّت تھی۔ اِس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے کیا جا سکتا ہے، جو خود مجھ پر گزرا ہے۔ ہُوا یہ کہ وُہ شدید بیمار ہو گئیں۔ ڈاکٹروں نے تاکید کی کہ وُہ چارپائی پر مسلسل آرام کرتی رہیں۔ ہلنے جلنے سے اُن کی جان کو خطرہ ہے۔ اِتّفاق کی بات کہ اُس کمرے میں جہاں اُن کا پلنگ تھا، مَیں بھی سویا ہُوا تھا۔ اُس رات مجھے معمولی سا ملیریا بُخار ہو گیا، جو رفتہ رفتہ خاصا تیز ہو گیا اور مجھ پر غفلت سی طاری ہو گئی۔ رات کے پچھلے حصّے میں راقم الحرُوف نے آہٹ سی سُنی، جیسے کوئی کمرے میں چل پھر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ خالہ محبُوب بیگم اپنے پلنگ سے اُتر کر رینگتی ہُوئی کمرے کے درمیان تک پہنچ چکی تھیں۔ ان سے کمزوری کے مارے کھڑا نہیں ہُوا ہُوا جاتا تھا۔ میں اُن کی یہ حالت دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھا: خالہ! آپ کیا غضب کر رہی ہیں؟ اُنھوں نے جواب دیا ـــــ

"تم نے بخار کی غفلت میں پانی مانگا تھا۔ میں پانی کے مٹکے تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہُوں تاکہ تمھیں

پانی پلا سکوں"۔

مَیں جلدی سے اُٹھا اور سہارا دے کر خالہ کو پلنگ پر لٹایا اور مٹکے سے پانی نکال کر پلایا۔

ہمارے ساتھ جو اُن کو محبت ہے، اُسے بے اندازہ کہہ کر اُن کی محبت کی واقعی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ایک بار میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا؛ خالہ! سارے اِنتظامات میں کیے دیتا ہُوں۔ آپ حج کر آئیں۔ اِس پر اُنھوں نے بڑی حسرت سے مجھے دیکھا اور بولیں ——

"خدا تمھیں اِس کا اجر دے۔ مجھے تم سب سے اِتنا پیار ہے، جس پر مجھے قابُو نہیں ہے۔ مَیں اپنا جسم عرب پہنچا کر اور دل تمھارے پاس چھوڑ کر اپنے خُدا کو دھوکا دینا نہیں چاہتی!"

اِن تینوں بہنوں کی آپس میں مَحبّت ہمارے خاندان میں ضربُ المثل بن گئی ہے۔ ایک دُوسرے پر سچ مُچ جان چھڑکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تینوں بہنیں بقیدِ حیات ہیں۔ وُہ اکثر کہا کرتی ہیں کہ ایسی قبر کا ڈیزائن تیار کراؤ، جس کے تین حصّے ہوں تاکہ جس طرح زندگی اکٹھے بسر کی ہے، اِس طرح دُوسرے جہان میں بھی ساتھ ساتھ رہیں۔

میری والدہ کی عمر خدا کے فضل سے اس وقت اسّی سال سے

بھی دو تین سال کچھ اُوپر ہی ہے اور خالہ محبوب بیگم اُن سے چھ سات سال چھوٹی ہیں، لیکن پچھتّر سال کی عُمر میں جو بڑھاپے کی زندگی ہے۔ اُن کے قوٰی مضبُوط ہیں اور اُن کے ذہن اور ہوش و حواس کو بڑھاپے نے متاثّر نہیں کیا۔ جوانی میں جس طرح وہ حاضر جواب تھیں، اب بھی اُن کی طبیعت اور ذہانت کا وُہی رنگ ہے۔ میری والدہ اور خالہ محبوب بیگم لاہور میں ایک ساتھ رہتی ہیں۔ گھر کا سارا اِنتظام اُنھی کے ہاتھ میں ہے۔ میری والدہ کو اُن کا نائب (Assistant) سمجھنا چاہیے۔ وہ اُن کی ماتحت بن کر کام کرتی ہیں۔ گھر میں پُورا عمل دخل خالہ صاحبہ کا ہے۔ وہ حاکم ہیں۔ ہم تو اُن کی رعایا ہیں ـــــ

ہم جب بچّے تھے تو ہماری پرورش اور دیکھ بھال میں وہ مصرُوف رہیں۔ جب ہم جوان ہو گئے اور شادیاں ہو گئیں تو ہماری اولاد کی نگہداشت اور تربیت اُنھوں نے اپنے ذمّے لے لی ـــــ اور اُسی محبّت اور خلوص سے جو اُن کے دل میں ہمارے لیے تھا، ہمارے بچّوں کو پالا پوسا اور اُن کی سرپرستی کی۔

محبّت و غم خواری کا یہ جذبہ صرف اِنسانوں تک محدُود نہیں ہے، جانوروں اور پرندوں کے ساتھ بھی اُن کا سلوک ہمدردانہ ہے۔ اُن کے یہاں بہت سی مُرغیاں پلی ہُوئی ہیں۔ اِتّفاق سے ایک مُرغی کی جو شامت آئی تو بے چاری کی ٹانگ ٹُوٹ گئی۔ مُرغیوں، کبُوتروں اور بطخوں کی اِتنی

پرواکون کرتا ہے، مگر خالہ نے اُس مُرغی کو اپنی موٹر میں ویٹنری ہسپتال بھجوایا۔ ڈاکٹر نے اُس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو سیدھا کرکے پلاسٹر لگا دیا۔ اور کئی دن تک یہ مُرغی ہسپتال جاتی رہی اور اُس کی مرہم پٹی ہوتی رہی۔ یہ مُرغی ابھی تک زندہ ہے مگر لنگڑا کر چلتی ہے۔ علاج معالجے کے باوجود اُس کی زخمی ٹانگ میں کسی قسم کی کوئی کسر اور کجی رہ گئی۔

اسی طرح اُن کا پالا ہُوا مُرغ بیس بائیس سال تک زندہ رہا۔ بُڑھاپے کے سبب اُس کی بینائی جاتی رہی اور چونچ تک گر گئی —— بالکل فرتوت اور کھوسٹ ہوگیا تھا —— خالہ اس مُرغ کو اپنے ہاتھ سے دانا دُنکا اور آٹے کی نرم گولیاں کھلاتیں۔ یہ مُرغ اپنی طویل عُمر کی وجہ سے اِس قدر مشہُور ہوا کہ لاہور کے "پاکستان ٹائمز" میں اُس کی تصویریں شائع ہوئیں۔ اُس کا پیار کا نام "گاماں" تھا۔ اُس مُرغ کو لاہور سے بیس پچیس میل دُور ہمارے گاؤں رائے ونڈ میں رکھا گیا تھا۔ جب اُسے اخبارات کے فوٹو گرافروں کو دکھانے کے لیے وہاں لایا گیا تو دونوں بہنوں کی ہدایت کے مطابق ایک شخص کے سر پر خُوب بڑی سی پگڑی بندھوائی گئی اور معقُول معاوضہ دے کر اُسے اِس کے لیے تیّار کیا گیا کہ وُہ مُرغ کو سر پر رکھ کر رائے ونڈ سے لاہور لے کر آئے۔ ریل گاڑی سے مُرغ کو نہ لایا جائے۔

مُرغ کو اس اہتمام سے لے جائے جانے کی حکمت یہ بیان

کی گئی ــــــ

"اُسے ریل میں لایا گیا تو کہیں اِس غم اور
اندیشے سے کہ اُسے ذبح کرنے کے لیے لایا جا رہا ہے،
وہ دم نہ دے دے اور راستے ہی میں نہ مر جائے۔"

مجھے دو نہایت ہی خوب صورت السیشن کتّے ایک دوست نے دیے تھے۔ میں نے اُن دونوں کُتّوں کو والدہ صاحبہ اور خالہ کے پاس لاہور کی کوٹھی میں بھیج دیا، جہاں وہ کئی سال تک رہے۔ جب یہ کتّے بوڑھے ہو گئے اور اُن کی حالت بڑی سقیم اور کمزور ہو گئی تو میں نے کہا کہ یہ بیچارے بڑی تکلیف اور سخت ضیق میں مبتلا ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ڈاکٹر سے ایسا ٹیکہ لگوا دیا جائے کہ یہ اس تکلیف سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا جائیں۔ میرے اِس مشورے پر خالہ صاحبہ نے فرمایا ــــــ

"اِن کو اس بات کی سزا دینا چاہتے ہو کہ
اِنھوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری
حفاظت کی ہے۔"

اِس کے بعد میں کیا کہتا، خود ہی خفیف اور پشیمان ہو کر رہ گیا۔

جس کوٹھی میں یہ دونوں بہنیں رہتی ہیں، وہاں کا معمول یہ ہے کہ صُبح نَو بجے آس پاس کے کوّوں کا ناشتہ شروع ہوتا ہے۔ پراٹھوں کو پکتا دیکھ کر کوّے مقررہ وقت پر ناشتے کے لیے آنے لگتے ہیں اور ذرا سی

دیر میں عربی کے اِن "غرابوں" اور انگریزی کے اِن "Crows" کا جمگھٹا ہو جاتا ہے۔ پراٹھوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اُن کے آگے ڈالے جاتے ہیں اور وہ پیٹ بھر کر خوشی خوشی واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ کوّے اِس مکان اور اس کے رہنے والوں سے اِتنے مانُوس ہو گئے ہیں کہ آدمی کو قریب آتا جاتا دیکھ کر خوف محسُوس نہیں کرتے۔ اِن میں بعض کوّے تو عجب انداز میں پینترے بدل بدل کر زمین پر چلتے اور پراٹھے کے ٹکڑے نوشِ جان کرتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ یہ کوّے اپنے جی میں یہ سمجھتے ہوں کہ دُنیا جہان کے تمام کوّوں کو اسی اہتمام کے ساتھ غذا ملتی ہے اور انھیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کوئی خاص دوڑ دھوپ نہیں کرنی پڑتی۔ صبح کے وقت کوٹھی کے صحن میں کوّوں کے پرے ایسے نظر آتے ہیں، جیسے بادل کا کوئی سیاہ ٹکڑا زمین پر تیر رہا ہے۔

کوّوں کے علاوہ چڑیوں کی بھی اِس کوٹھی میں ضیافت اور مہمانداری کی جاتی ہے۔ ان کا مُعاملہ کوّوں سے مُختلف ہے۔ کوّوں میں پھر اجنبیّت پائی جاتی ہے، مگر یہ چڑیاں اِس قدر سدھ گئی اور مانُوس ہوگئی ہیں کہ جس پلیٹ میں والدہ اور خالہ کھاتی ہیں، اُسی میں یہ بھی شریک ہو جاتی ہیں۔ یُوں کہیے یہ چڑیاں اِن دونوں بہنوں کی سچ مُچ ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں۔ وہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب یہ ننّھی جانیں پلیٹ کے اِردگرد اِس طرح منڈلاتی ہیں، جیسے اِنسانی ہمدردی نے اُن کے دلوں میں

خوف و خطر کا کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رکھا۔ پیٹ بھر جاتا ہے تو یہ چڑیاں پُھر سے اُڑ جاتی ہیں۔ میں چند دِن کے لیے لاہور گیا اور کوٹھی میں ٹھہرا تو وہاں کوّوں اور چڑیوں کے ناشتے کا دلچسپ منظر باقاعدگی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اِتفاق سے اُن دِنوں والدہ صاحبہ اور خالہ کا چند دِن کے لیے لاہور سے باہر جانا ہو گیا۔ میں نے نوکروں کو تاکید کی: دیکھو۔ اِس ناشتے کے معمُول میں فرق نہ آنے پائے۔

لاہور میں قیام کے زمانے میں مجھے بھی دو دِن کسی ضروری کام سے باہر رہنا پڑا۔ تیسرے دِن جب میں واپس آیا تو ناشتے کے وقت کسی ایک کوّے کو بھی وہاں نہ دیکھ کر ملازموں سے دریافت کرنا پڑا کہ یہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کوّوں نے آنا کیوں چھوڑ دِیا۔ نوکروں نے کہا کہ صاحب! آپ کی ہدایت کے مطابق کوّوں کو روٹی کے ٹکڑے تو ڈالے گئے مگر وہ گھی کے پراٹھے نہ تھے۔ رات کی بچی ہُوئی روٹیوں کے ٹکڑے تھے۔ کوّوں نے سُوکھی روٹیاں کھانے سے اِنکار کر دیا۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا کہ بعض سیاسی لیڈروں کی دیکھا دیکھی یہ کوّے بھی "بھوک ہڑتال" سے واقف ہو گئے۔

چند دِن کے بعد دونوں بہنیں آگئیں اور اُنھوں نے معمُول کے مُطابق پراٹھے دینا شرُوع کیے تو رفتہ رفتہ سب کوّے واپس آ گئے۔ اور دو چار زیادہ خوددار اور چِڑچِڑے کوّے نہ بھی آئے ہوں تو اُن

کی گنتی اور "زاغ شماری" کون کرتا۔

خالہ کی ازدواجی زندگی بہت ہی مختصر رہی۔ ع

رُوئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد!

پھر اولاد کی نعمت سے محرومی، لیکن ان سانحوں کے باوجود اُن کے حوصلے کی بلندی قابلِ داد ہے۔ ایک بار مجھ سے فرمایا——

"وحید! مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہُوں کہ جن مصائب اور آزمائشوں میں مجھے مُبتلا کیا ہے، میری دونوں بہنوں کو اُن سے محفوظ رکھا۔ یہ مسرّت میرے لیے کیا کم ہے"۔

یہ جُملہ اُن کی زبان سے سُن کر مَیں اُن کی عظمت کا اور بھی قایل ہو گیا کہ اِس محرُومی میں بھی اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے شُکر کا پہلُو بلکہ جواز تلاش کر لیا۔ اور اپنی بہنوں سے وُہ کس قدر محبّت کرتی ہیں اور اِس تصوّر سے کس درجہ خوش اور مطمئن ہیں کہ جس غم سے وُہ دوچار ہیں، اُس سے اُن کی ماں جائی بہنیں تو محفُوظ ہیں۔

یہ خداداد ذہانت قریب قریب تینوں بہنوں میں مشترک ہے۔ والدہ صاحبہ اپنی سادگیِ طبع اور بھولپن کے باوجُود کبھی کبھی ایسی نُکتے کی بات کہہ جاتی ہیں کہ اُس کی معنویت پر ذہن و فکر حیران رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اپنا ہی واقعہ بیان کرتا ہُوں۔

ایک سال کپاس کے کاروبار میں مجھے کافی نقصان ہُوا۔ میں فرشتہ نہیں ہُوں۔ گوشت پوست کا بنا ہُوا انسان ہُوں۔ اِس خسارے کا میری طبیعت نے گہرا اثر قبول کیا۔ ہر بڑے سے بڑے تاجر کو تھوڑے سے گھاٹے پر بھی افسوس ہوتا ہے اور یہ تو بہت بڑا خسارہ تھا، جس نے میرے مالیات کے توازن کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ مَیں نے اِس خسارے کا حال والدہ صاحبہ سے چھپایا کہ اِس بڑھاپے میں میری مُحبّت کے سبب اُن کو دُکھ ہوگا، مگر اُنھیں کسی طرح اِس کا پتہ چل گیا۔ وُہ میرے پاس آئیں اور فرمانے لگیں، "میں نے سُنا ہے، تمھیں کاروبار میں نقصان ہُوا ہے۔ جبھی تو تم کئی دِن سے چُپ چُپ سے رہتے ہو، مگر بیٹیا! یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب تک خُدا تم کو دیتا رہے، تُم خوش رہتے ہو اور اگر ایک بار وہ تمھارے مال سے کسی دوسرے ضرورت مند کی حاجت روی کرا دے تو تم بددل اور ناراض ہو جاتے ہو۔ یہ بات کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر وُہ چاہے گا تو پھر واپس کر دے گا۔"

والدہ صاحبہ کی اِس نصیحت نے میرے غم کو ہلکا کر دِیا۔ ایسا محسُوس ہُوا، جیسے تپتے گھاؤ پر خنک مرہم رکھ دِیا گیا۔ آنے والی زندگی میں مُشکلات کے لیے مجھے ایک حل مل گیا۔ خُدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ اگلے سال اِس نقصان کی تلافی ہوگئی اور پریشانیوں کے وُہ بادل چھٹ گئے۔ جیسا کہ مَیں اُوپر بیان کر چکا ہُوں کہ ہم سب بہن بھائیوں کی

پرورش اور نگہداشت کا فرض صحیح معنوں میں خالہ محبوب بیگم نے ادا کیا۔
اس کا صحیح احساس ہم سے زیادہ خود ہماری والدہ کو رہا ہے۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہُوا یہ کہ ایک بار میرے عزیز دوست جناب ایم خورشید (جو اُس زمانے میں صُوبائی حکومت کے چیف سیکریٹری تھے) کی بیگم صاحبہ نے، جو مُجھے بہن کی طرح عزیز رہی ہیں، خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کی والدہ صاحبہ سے ملنا چاہتی ہُوں۔ اس کے بعد اُن کے اصرار کو دیکھتے ہُوئے مَیں نے والدہ صاحبہ کی خدمت میں بیگم خورشید کی اِس خواہش کا اِظہار کر دیا۔

والدہ صاحبہ میری بات سُن کر معمُول سے کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئیں اور میری طرف غور سے دیکھا۔ مَیں اُن کے اس طرح دیکھنے پر سہم گیا۔ پھر وہ بولیں ——

"وحید! تمھاری اصل ماں محبُوب بیگم ہے،
جس نے تمھیں پال پوس کر اس قابل بنایا ہے۔ میری
بجائے اُنھیں محبُوب سے ملاؤ"۔

اُن کی زبان سے یہ لفظ سُن کر مَیں حیران اور لاجواب سا ہو گیا۔
فرطِ جذبات کا یہ عالم جیسے مَیں بچّے کی طرح رو پڑوں گا!

بہن کی زبان سے بہن کی محبّت اور بہن کی اولاد کی خدمت اور دیکھ بھال کا پُرخلوص اعتراف! حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ

"خالہ ماں کا بدل ہوتی ہے"۔
صدقتَ یا رسُولَ اللہ! (رُوحی فداکَ)۔

اُن کی شفقت اولاد پر جتنی ہے، اُس سے شاید کچھ ہی کم نوکروں اور ملازموں پر ہوگی۔ بعض اوقات یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ ملازم ہے یا کوئی عزیز رشتہ دار ہے۔ نوکروں کے آرام و راحت کا وُہ زیادہ سے زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ پہلے انھیں کھلاتی ہیں، بعد میں خود کھاتی ہیں نوکر کے ہاتھ سے کوئی برتن یا چیز ٹُوٹ جائے، کسی کام کو وُہ بگاڑ دے، والدہ صاحبہ کو پھر بھی غُصّہ نہیں آتا۔ ایک بار ایسا ہُوا کہ کسی بات پر مُلازم کو وُہ ہلکی سی سرزنش کر رہی تھیں۔ میرے چھوٹے بھائی نے اِس پر کہا ——

"بی بی! اِس کا پیچھا چھوڑ دو۔ اِس پر رحم کرو!"
والدہ صاحبہ نے جواب میں فرمایا ——
"تُم ——! تُم مجھے رحم کی تلقین کرتے ہو؟
کہ تُم نے خود میرے رحم سے تھوڑا سا حِصّہ لیا ہے!"

ایک دفعہ مجھے کچھ تکلیف تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ شکر آنی شرُوع ہو گئی ہے۔ میٹھا کھانا بند کر دو۔ مَیں نے اِس مشورے پر سختی کے ساتھ عمل کیا اور کیوں نہ کرتا، جان کا مُعاملہ تھا۔ کاش! مَیں اور ہم سب گناہ و ثواب کے مُعاملے میں اللہ تعالیٰ کے حُکم پر اِس

طرح عمل پیرا ہو سکتے ——!

بیماری اور علاج کے مُعاملات میں والدہ صاحبہ کی منطق، ڈاکٹروں اور طبیبوں کی رائے اور مشورت سے مُختلف ہے۔ اُن کا قول یہ ہے کہ ہر بیماری کا علاج غذا سے ہونا چاہیے اور بہتر سے بہتر غذا کھانی چاہیے تاکہ جسم میں قوّتِ مدافعت قائم رہے۔ خُود اُنھوں نے ساری زندگی اس پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے بیاسی (۸۲) سال کی عُمر میں وہ عینک کے بغیر لکھتی پڑھتی ہیں۔ اُن کے پُورے کے پُورے دانت صحیح سلامت ہیں۔ کسی تکلیف کے بغیر چلتی پھرتی ہیں اور ذہنی توانائی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہُوا۔ اِس بُڑھاپے میں وُہ اپنی اولاد سے کم چُست اور چاق و چوبند نہیں ہیں۔

جب اُنھیں معلُوم ہُوا کہ ڈاکٹر نے میٹھا کھانے سے مجھے منع کیا ہے تو اُنھوں نے خاصی مقدار میں میٹھا ڈال کر لذیذ حلوہ تیّار کرایا۔ اُس کے ساتھ زردہ اور بالائی ایک سینی میں لگا کر ملازم کو لیے ہُوئے میرے پاس آئیں اور بڑے پیار کے لہجے میں بولیں ——

"اِسے کھاؤ"

مَیں نے کہا: "بی بی! یہ تو میرے لیے زہر ہے اور...."

اُنھوں نے میری بات کاٹتے ہُوئے دریافت کیا ——

"تم مسلمان ہو؟"

میں نے عرض کیا — "جی ہاں!"

پھر فرمایا —

"کیا تمھارے دین وایمان کے مطابق موت کا وقت مقرر نہیں ہے؟"

میں نے جواب میں کہا — "ہاں!"

اس پر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ بولیں —

"تو پھر فاقے کر کے کیوں مرتے ہو؟ کھا کر مرو —!"

مَیں اُن کی اِس شفقت آمیز منطق کو سُن کر لاجواب ہو گیا۔

— بظاہر —

آج کے معاشرے میں یہ واقعات جو اُوپر بیان کیے گئے، قصّے کہانی معلوم ہوتے ہیں، مگر حقیقت میں یہ اُن ماؤں کے قصّے اور کہانیاں ہیں، جنھوں نے اَخلاقی خطوط پر اولاد کی تربیت و پرورش اور خلقِ خدا کی خدمت و ہمدردی کو زندگی کا نصب العین سمجھ رکھا ہو۔ جن کی گود دبستانِ اَخلاق اور سیرت و کردار کی صحیح تربیت گاہ ہو —! کردار کے اِن دلچسپ پہلوؤں اور گوشوں میں آئندہ نسلوں کے لیے عبرت اور سبق موجود ہیں۔ تعلیم کا مقصد لفظوں کا

صرف لکھنا اور پڑھ لینا نہیں، بلکہ انسان کو انسانیت کی محبت کے گر اور آداب سکھانا ہیں ۔ ایسی تعلیم اسی مزاج اور سیرت کی خواتین کے دامنِ عاطفت اور سایۂ شفقت میں حاصل ہو سکتی ہے ——

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

چودھری محمّد ظفراللّٰہ خاں

ممتاز قانون داں اور بین الاقوامی شہرت کے جج، چودھری سر ظفراللّٰہ خاں سے میرے ذاتی بلکہ خاندانی مراسم رہے ہیں۔ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ اُن کا آبائی وطن ہے۔ اُن کے والد بھی نامور وکیل تھے۔ اُنھیں سے میرے بزرگوں کے تعلّقات کا آغاز ہوا۔ بعد میں اُن کے چھوٹے بھائی شکراللّٰہ خاں اور عبدُاللّٰہ خاں میرے گہرے دوست رہے۔

چودھری صاحب نے بیرسٹری پاس کر کے لاہور میں پریکٹس شروع کی تو رہائش ہمارے آبائی مکانات کے قریب ہی اختیار کی اور چند ابتدائی مقدّمات کی پیروی کرنے کے بعد ہی اُنھیں اپنے ہم عصروں میں نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی۔ اُس زمانے میں تعلّقات محض رسمی بات نہ سمجھے جاتے تھے بلکہ انھیں برادرانہ محبّت اور خلوص کا درجہ

حاصل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ والد مرحوم جن دنوں غیر متوازن اور زائد اخراجات کی وجہ سے مقروض تھے۔ اُنھیں بعض مقدمات بھی لڑنا پڑے۔ چودھری ظفر اللہ خاں بغیر کسی فیس کے، پوری دماغ سوزی اور جانفشانی کے ساتھ اُن کے مقدمات کی پیروی کرتے رہے۔ ایک دوست کی مشکلات سے باخبر رہنا اور فرض سمجھ کر اُس کی اعانت کرنا، کردار کی بڑی خوبی ہے اور دوستی کا صحیح مفہوم بھی یہی ہے۔

اپنی غیر معمولی ذہانت اور خداداد لیاقت کی بنا پر اُن کی پریکٹس بہت جلد چمک گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا شمار پنجاب ہائی کورٹ کے ممتاز ترین وکلاء میں ہونے لگا۔ کچھ عرصے بعد پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ ایک طرف اُن کی خداداد صلاحیتیں تھیں اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کی نگاہِ کرم۔ سرکاری منصب یا عہدہ حاصل کرنے کے لیے جوڑ توڑ اور دَوڑ دھوپ، اِس فن سے اُن کی طبیعت کو کبھی کوئی مناسبت نہیں رہی۔ منصب اور اعزاز کی اُنھوں نے خود تمنا نہیں کی بلکہ یہ خود اُن کے تعاقب میں رہے۔ حکومت نے پیش کش کی کہ وہ پنجاب ہائی کورٹ کا جج بننا قبول کریں۔ اُنھوں نے یہ پیش کش پسند نہ کی اور شکریے کے ساتھ انکار کر دیا، لیکن جب میاں فضل حسین چند ماہ کے لیے رخصت پر گئے تو چودھری صاحب نے چھ ماہ تک قائم مقام ممبر،

وائسرائے ایگزیکٹو کونسل کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

برِصغیر ہند کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے لندن میں یکے بعد دیگرے جو تین راؤنڈ ٹیبل کانفرنسیں ہوئیں، اُن سب میں اُنھوں نے ہندوستان کی نمائندگی کی اور بنیادی اہمیت کے مسائل کی ترجمانی کا حق اپنے ضمیر کے اِطمینان کی حد تک نمایاں طور پر ادا کیا۔

برطانوی ہند کے وائسرائے کا دستور تھا کہ مہینے میں ایک مرتبہ اپنی ایگزیکٹو کونسل کے کسی ہندوستانی ممبر کے ہاں ڈنر کھانا قبول کرتا۔ اِس طرح ایک تو حکومت اور ممبروں کے درمیان روابط مضبوط ہوتے اور دُوسرے اِسے اُس ہندوستانی ممبر کی عزّت افزائی سمجھا جاتا۔

جب چودھری ظفر اُللہ خاں کی باری آئی تو اُنھوں نے وائسرائے سے کہا کہ میرے ہاں ڈنر کی بجائے لنچ قبول کیا جائے تو زیادہ موزُوں ہو گا۔ ساتھ ہی وجہ بیان کی کہ ——

"رات کے کھانے پر شراب پیش کرنا میزبان کے فرائض میں شامل سمجھا جاتا ہے اور میرے گھر میں یہ چیز مہیّا نہیں ہو سکتی"۔

وائسرائے نے چودھری صاحب کی معذرت کا مقصد سمجھ لیا۔

اور رات کے کھانے کی بجائے دِن کے کھانے کی بات طے پا گئی۔ یہ بات بظاہر معمُولی ہے، لیکن جو لوگ مصلحتوں کے لیے آناً فاناً اصُول قُربان کر ڈالتے ہیں، اُن کے لیے عبرت کے پہلُو سے خالی نہیں۔

دیرینہ تعلّقات کو وضعداری کے ساتھ قائم رکھنا، ہر ملاقاتی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا اور مختصر سی گفتگو سے مخاطِب پر اپنی شخصیّت اور بالغ نظری کا نقش قائم کر دینا اُن کے اَخلاق و کردار کی قابلِ ذکر مثالیں ہیں۔ یہ مثال اِس اِعتبار سے اور بھی دِلچسپ ہے کہ اُن سے ملنے والا خواہ کسی علمی استعداد اور ذہنی سطح کا آدمی ہو، موصُوف اپنی خُوش خلقی کے باعث اُسے کسی اِحساسِ کمتری میں مُبتلا نہیں ہونے دیتے۔ گفتگو کرتے وقت تفنّنؔ اور بذلہ سنجی کا جو بھی موقع مِل جائے اُسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اِس کی ایک مثال یہ ہے کہ جن دنوں چَودھری صاحب پاکستان کے وزیرِ خارجہ تھے، ہندوستان کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرُو کراچی آئے۔ یہاں اُن کے اعزاز میں ایک شاندار دعوتِ استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا۔ میں بھی اِس میں شریک تھا۔ دعوت سے چند روز پیشتر چودھری صاحب نے مجھے پیغام بھیجا کہ پنڈت نہرُو کی واپسی پر میں چند روز کے لیے لاہور جاؤں گا۔ اِس موقع پر تُمھاری موٹر میری سواری میں رہے گی۔ چُنانچہ میں نے لاہور ٹیلیفون کر کے فوراً ہدایت کر دی

دعوتِ استقبالیہ میں چودھری صاحب سب مہمانوں سے ملتے ملاتے میری طرف بھی آئے اور ہنس کر فرمایا ــــــ

"بھائی! تمھیں میرا کام یاد ہے ؟"

میں نے عرض کیا ــــــ

"بھلا باپ کا حکم بیٹا کبھی بھول سکتا ہے"۔

اُن کے سامنے میرا ماضی بھی تھا اور والد مرحوم کی زندگی بھی' فوراً مسکرائے اور کہا ــــــ

"میاں! اگر اِس طرح میرا حکم مانو گے' جس طرح اپنے باپ کا حکم مانتے تھے تو میرا کام ہو چکا۔ ہاں' اگر اِس طرح مانو گے' جس طرح میری بات وہ مانتا تھا تو یقیناً ہو جائے گا"۔

اِس جملے پر حاضرین نے' جن میں میرے بعض عزیز بھی شامل تھے' اِس زور کا قہقہہ لگایا کہ سب مہمانوں کی نظریں ہماری طرف اُٹھ گئیں۔

جوانی کے جذباتی دَور میں ایک دفعہ چودھری صاحب کے سامنے برسبیلِ تذکرہ میرے مُنہ سے نکل گیا کہ میکاولی کا حافظہ بہت اچھّا تھا۔ اس کے بعد مجھے میکاولی کے دو ایک جملے ازبر تھے' وہ حرف بحرف سُنا دیے ــــــ عنفوانِ شباب کا عالم

تھا، فکر کی پختگی حاصل نہ تھی۔ اِس موقع پر میں نے لفظ بلفظ جو فقرے سُنائے، اُس میں ایک طرح اپنی قابلیّت کا اِظہار مقصود تھا۔ یہ کمزوری لوگوں میں عام نظر آتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اِس سے بالاتر نہ رکھ سکا۔

چودھری صاحب میری کوشش کی تہ کو پہنچ گئے اور اس سے لُطف بھی اُٹھایا، لیکن یہ بات اُنھیں ہمیشہ یاد رہی ——— چنانچہ آج تک جب بھی مُلاقات کا موقع ملتا ہے، گفتگو کے دوران کسی نہ کسی طور پر میکالے کا ذکر ضرور کر جاتے ہیں ——— حتّٰی کہ جب میں نے ۱۹۶۴ء کے آخر میں "روزگارِ فقیر" شائع کر کے اُس کا ایک نُسخہ اُن کی خدمت میں نیُویارک بھجوایا تو اُنھوں نے اس پر اظہارِ پسندیدگی فرماتے ہُوئے مجھے یہ فقرہ لکھا ———

"مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ تم صِرف میکالے کے اسکالر نہیں ہو، بلکہ اِس کے علاوہ اور بھی کچھ جانتے ہو۔"

شیخ اعجاز احمد صاحب نے ایک مُلاقات کے دوران مجھے یہ دلچسپ واقعہ سُنایا کہ جن دنوں علاّمہ اقبالؒ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پیامِ مشرق" مرتّب فرما رہے تھے، اُنھیں ایک

مقدّمے کی پیروی کے سلسلے میں جھنگ جانا پڑا۔ عجیب اتّفاق ہے کہ اُسی مقدّمے میں سر عبدُالقادر اور چودھری سر محمّد ظفراللہ خاں بھی پیش ہو رہے تھے اور جھنگ جاتے وقت علاّمہ اقبالؒ کے ہم سفر تھے۔ علاّمہ مرحُوم ریل کے سفر کے دوران سر عبدالقادر اور چودھری سر محمّد ظفراللہ خاں کو "پیامِ مشرق" کے اشعار سناتے رہے۔ "پیامِ مشرق" کی "پیش کش بحضُورِ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں، فرماں روائے افغانستان" میں، جہاں علاّمہ نے پیرِ مغرب، شاعرِ المانوی (گوئٹے) کا اور اپنا مقابلہ کرتے ہُوئے فرمایا ہے ــــــــ

اُو چمن زادے، چمن پروردۂ
من دمیدم از زمینِ مُردۂ!
اُو چو بُلبل در چمن فردوس گوش
من بہ صحرا چُوں جرس گرمِ سروش

وہاں اُنھوں نے مُندرجۂ ذیل دو اشعار بھی ان دونوں احباب کو سُنائے تھے، جو بعد میں کسی وجہ سے "پیامِ مشرق" میں شائع نہیں ہُوئے اور اب صرف چودھری صاحب اور شیخ صاحب کے حافظے میں محفُوظ ہیں ــــــــ

اُو ز محبُوبیِ عزیزِ کشورے
من چو یوسف ہندیِ سوداگرے

از غلامی ضعفِ پیری در بدن
از غلامی رُوح گردد بارِ تن

اِس چھوٹے سے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چودھری صاحب صرف ایک اعلیٰ قانُون داں ہی نہیں ہیں، ادب و شاعری سے بھی اُنھیں گہرا شغف ہے۔ شاید اسی لیے اپنی تحریر اور گفتگو میں اردُو اور فارسی کے معیاری اشعار بیان کر جانا اُن کا معمُول ہے۔

دوستوں کے ساتھ وضعداری، چھوٹوں کے ساتھ رواداری کا یہ عالم ہے کہ چوَدھری صاحب اب بھی جب پاکستان تشریف لاتے ہیں تو اپنے پُرانے دوستوں کو اور اُن کے بچّوں کو خاص طَور پر بُلواتے ہیں اور کوشش یہی کرتے ہیں کہ اُن کا میزبان اُن سب کو کھانے پر مدعو کرے۔ ایک سال پہلے کی بات ہے، وہ کراچی تشریف لائے میرے لڑکے ایاز الدّین نے کہا کہ میں بھی چودھری صاحب کو دیکھنا چاہتا ہُوں، لہٰذا میں اُسے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اِس ملاقات میں چودھری صاحب سے جو گفتگو ہُوئی اور مختلف معاملات پر وہ جس انداز سے باتیں کرتے رہے، میرا لڑکا جو چند سال قبل ولایت سے تعلیم حاصل کر کے آیا ہے، اُس سے بہت متاثّر ہُوا اور چودھری صاحب کی غیر معمُولی ذہانت پر ششدر ہو کر اُس نے واپسی پر مجھ سے سوال کیا کہ۔

”چودھری صاحب کی اِس قدر کامیابی اور

ترقی کا راز اُن کی ذہانت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے ــــ!"

میں نے کہا ــــ ہاں! ــــ میں تمھیں سب سے بڑا راز بتا سکتا ہُوں ــــ

"ماں کی دُعا"

یہ بات میں نے اس علم کی بنا پر کہی کہ چودھری صاحب کو واقعی اپنی والدۂ ماجدہ سے بے پناہ محبّت تھی اور وہ ہمیشہ ایک سعادت مند بیٹے کی طرح اپنی ماں کا احترام کرتے رہے۔ اُن کی والدہ بھی اپنے فرمانبردار بیٹے پر جان چھڑکتی تھیں اور ہر وقت کی دُعاؤں میں اُنھیں یاد رکھتی تھیں۔

دُوسرے دِن پھر چودھری صاحب سے مُلاقات ہُوئی تو میں نے لڑکے کا سوال اور اپنا جواب اُنھیں سُنایا۔ چودھری صاحب نے فرمایا ــــ

"تم نے سچ کہا"

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے گہری سوچ میں پڑ گئے، جیسے اُنھیں اپنی شفیق والدہ کی تربیت اور محبّت کا زمانہ یاد آ گیا ہو اور اُن کی بے پناہ شفقت سے محرُومی کا احساس جاگ اُٹھا ہو۔

سادگی، شرافت، صاف گوئی اور معاملہ فہمی اُن کی فطرتِ ثانیہ

ہے ۔ خدا نے اُن کو بڑے سے بڑے منصب پر سرفراز کیا، لیکن اُنھوں نے کبھی اپنے آپ کو خُدا کے ایک حقیر اور ناچیز بندے سے زیادہ نہ سمجھا۔ تکبّر اور نخوت کی آلُودگی سے اُن کا دامن ہمیشہ پاک رہا ۔ اپنی ضرُوریات کو اُنھوں نے اس قدر محدُود کر رکھا ہے کہ ہزاروں روپے کی ماہوار آمدنی ہوتے ہُوئے اُن کی اپنی ذات پر چند سو روپے سے زیادہ صَرف نہیں ہوتے ۔ باقی روپیہ ہر ماہ ضرُورت مند طلباء اور مُستحق غریبوں اور یتیموں کو بھیج دیتے ہیں ۔ جس زمانے میں اقوامِ مُتّحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر منتخب ہُوئے تو اُن کا معمُول یہ تھا کہ علی الصّبح بیدار ہو کر غُسل کرتے، تولیہ صابن تک خود لے کر جاتے، پھر نماز پڑھتے، اپنے کپڑوں پر خود استری کرتے، اس کے بعد اپنے ہاتھ کا تیّار کیا ہُوا ناشتہ کرتے، اپنے جُوتوں پر خود ہی پالش کرتے ۔ پھر سَیر کے لیے دو تین میل پیدل جاتے اور مقرّرہ وقت پر اقوامِ مُتّحدہ کے دفتر پہنچ جاتے —— کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ دفتر میں ایک منٹ کی تاخیر سے پہنچے ہوں ۔

اُن کی طبیعت میں اس قدر انکسار ہے کہ دُنیا اپنے دل میں انھیں کسی اعزاز اور مرتبے کی شخصیت سمجھتی ہو، وہ اپنا کوئی کام اپنے ہاتھ سے کرنا عار نہیں سمجھتے ۔

میری لڑکی کی شادی کے موقع پر اتّفاق سے چودھری صاحب

لاہور میں موجود تھے۔ مجھے اُن کی موجودگی کا علم نہ تھا، لیکن جیسے ہی اُنھیں معلوم ہُوا، میرے مکان پر تشریف لائے اور فرمایا: ''میں نے سُنا ہے کہ آج شام کو تمھاری لڑکی کی شادی ہے۔ اِس تقریب میں اگر کوئی کام میرے کرنے کا ہو تو بے تکلفی کے ساتھ کہہ دو۔ میں اس کے لیے حاضر ہُوں''۔

اُن کی اِس بزرگانہ شفقت سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور میرے مُنہ سے بے اِختیار نکلا کہ ''آپ نے آج والدِ مرحُوم کی غیر موجودگی اور اُن کی شفقت سے محرُومی کے اِحساس کو دُور کر دِیا——''

شام کو بارات کی پیشوائی کے لیے وہ میزبانوں کے ہمراہ موجود تھے۔ جب مہمانوں کو کھانا پیش کرنے کا وقت آیا تو چودھری صاحب خود اس اِنتظام اور نگرانی میں گھر والوں کی طرح شریک تھے۔ ہر مہمان کے پاس جا کر خوُد دریافت کرتے اور دیکھتے کہ کہاں اور کس میز پر کس چیز کی ضرُورت ہے؟

اکثر سوچتا ہُوں، اُن کی شہرت دُنیا کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے۔ اُن کے تعارُف اور شناسائی کا دائرہ نامحدُود ہے۔ سرکاری فرائض اور ذِمّے داریوں کے سلسلے میں اُن کی مصروفیات اپنی

جگہ ہیں۔ لیکن اِن سب باتوں کے باوجود اُنھوں نے
تعلّقات و مراسم کے لیے سالہا سال پہلے جو وضع
اِختیار کی تھی، وہ اپنی جگہ قائم ہے۔

اُنھیں دُنیا کے کسی مُلک سے جب بھی پاکستان آنے کا
موقع مِلتا ہے، مجھے اسی طرح یاد فرماتے ہیں۔ اُن کی ہر مُلاقات ایک
درس ہوتا ہے۔ باتوں باتوں میں قرآن و حدیث کے حوالے بھی اکثر
دیتے جاتے ہیں۔ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں اُن کا مُطالعہ
بے حد وسیع ہے۔

اُن کے بہت سے لطائف مجھے یاد ہیں، مگر وہ انگریزی زبان
میں ہیں۔ احتمال ہے کہ اردو میں منتقل کرنے سے اُن کا لطف جاتا
رہے گا۔ اِس لیے کہ ہر زبان کا خاص مزاج اور خاص انداز ہوتا ہے۔

—— ○ ——

نوّاب مشتاق احمدؐ گورمانی

اِن کے آبا و اجداد ٹھٹھ[1] گرمانی کے رہنے والے تھے۔ گورمانی صاحب اِس علاقے کے مشہور و معروف اور نامور زمیندار ہیں۔ سیاست و حکومت کے اُمور و مُعاملات میں ایک مُدّت تک اِن کا بڑا دخل رہا ہے، بلکہ یُوں کہنا چاہیے کہ اِس بحرِ موّاج کے وُہ بڑے مشّاق پیراک ہیں۔ ریاست بہاول پُور کے وُہ وزیرِ اعظم رہے ہیں اور اُس کے بعد مرکزی حکومتِ پاکستان میں وزیرِ داخلہ و اُمورِ کشمیر اور مغربی پاکستان کے گورنر کے بلند و جلیل عُہدے اُن کو میسّر آئے ہیں۔

میری اِن کی دوستی پچاس سال پہلے کی ہے۔ علی گڑھ اسکول میں ہم دونوں اِکٹھے پڑھتے تھے اور حُسنِ اتّفاق یہ کہ مُمتاز بورڈنگ

---

[1] یہ سندھ کا ٹھٹھہ نہیں ہے بلکہ ضلع منظفرگڑھ کا ایک گاؤں ہے۔

ہاؤس میں ہماری رہائش بھی ایک ہی کمرے میں تھی۔ ہر وقت کا ساتھ۔
ہم پیالہ اور ہم نوالہ۔ اگرچہ میں اور گورمانی ہم مزاج تھے، لیکن مجھے اس
حقیقت کے اظہار میں ذرا سا بھی باک نہیں ہے کہ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ
میں اُن سے پیچھے رہتا۔ وہ اِس منزل کے شہسوار تھے اور میں پیادہ۔
وُہ بچپن ہی سے بڑے ذہین، مُطالعے کے شوقین اور علم کے شیدائی تھے۔
میرا زیادہ وقت کھیل کُود کے مشاغل میں گزرتا۔ وہ اپنے تعلیمی شغف کے
سبب جماعت میں ممتاز رہتے اور میں کھلنڈرے پھسڈّی طلبا میں شمار ہوتا
ہمارے اسکُول کے انگریز ہیڈ ماسٹر کا نام Gage اور پرنسپل کا نام Towle
تھا۔ اُنھی دِنوں کسی اِنتظامی مُعاملے پر تنازعہ ہُوا اور اس بات نے اِس قدر
طُول کھینچا کہ یوروپین اساتذہ کے پُورے اِسٹاف نے کالج اور اسکُول
سے استعفا دے دیا۔ اِس وقت انگریزی حکومت کا آفتاب نصف النہار
پر تھا۔ انگریز چاہے کسی شعبے سے تعلّق رکھتے ہوں اور اُن کی چاہے کیسی
ہی حیثیت کیوں نہ ہو، حکمران قوم سمجھے جاتے تھے۔ اُن کی برتری کو ہندوستانی
مانتے تھے۔ اِس واقعے نے علی گڑھ کالج اور اسکُول کی اِنتظامیہ کو اِس
قدر متأثر کیا کہ یہ تعلیمی ادارے شدید ضیق اور آزمائش میں مُبتلا ہو گئے۔
وہاں کی فضا کا یہ رنگ دیکھ کر بہت سے لڑکوں کو اُن کے والدین اور
سرپرستوں نے واپس بُلا لیا۔ مُشتاق احمدؔ گورمانی بھی علی گڑھ سے واپس
چلے گئے اور مُلتان جو اُن کے گھر سے قریب ترین شہر تھا، وہاں کے اسکُول

میں داخل ہو گئے۔ میں نے لاہور کے مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔

چند مہینوں کے بعد گورمانی بھی ملتان ہائی اسکول چھوڑ کر لاہور آ گئے اور میں جس اسکول میں پڑھتا تھا، اسی میں داخل ہو گئے۔ اس طرح ہماری گم شدہ رفاقت واپس مل گئی اور ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہو گئے۔ مسلم ہائی اسکول کا انتظام مولینا صدر الدین کے ہاتھ میں تھا، جو لندن میں تبلیغِ اسلام کے فرائض انجام دے چکے تھے، انھیں اپنے مقصد سے لگن تھی، فرض شناس اور دُھن کے پکّے تھے، اس لیے انتظامی معاملات کے علاوہ تعلیمی امور میں بھی اسکول کا معیار روز بروز بلند ہوتا گیا۔

اسکول میں موسمِ گرما کی تعطیلات ہوئیں اور گورمانی اپنے وطن جانے لگے تو مجھ سے ساتھ چلنے کے لیے بڑا اصرار کیا، اُن کے اصرار کو دیکھ کر میرے والدین نے مجھے چند روز کے لیے ٹھٹھ گرمانی جا کر رہنے کی بڑی خوشی سے اجازت دے دی، وہاں پہنچا تو سب سے پہلے اُن کے والدِ بزرگوار سے نیاز حاصل ہوا۔ نہایت وجیہہ، سنجیدہ اور باوقار انسان تھے، چہرے مہرے سے شرافت اور بڑا پن ظاہر ہوتا تھا، مجھ سے بڑی شفقت سے ملے، میرے آنے پر خوشی کا اظہار فرمایا، مہمان خانے میں میرے قیام کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان کی بزرگانہ محبت کے سبب میرا زیادہ وقت ان کی خدمت میں گزرتا۔ اُن کے اس برتاؤ کو دیکھ کر

مَیں یہ سمجھتا تھا کہ وُہ مجھے اپنے بیٹے مُشتاق احمد سے کم نہیں چاہتے۔
اُن کے یہاں سائلوں، کارندوں اور مُلاقاتیوں کا دربار سا لگا رہتا۔ دو چل کر گئے اور چار آ گئے۔ ہر ایک کی بات وُہ توجّہ سے سُنتے، اَخلاق سے پیش آتے اور ہر کسی کی دِل دہی کی کوشش کرتے۔ تسبیح ہاتھ میں رہتی اور جب بھی موقع مِلتا، تسبیح پڑھنے رہتے۔ اللہ اور رسُولؐ کے ذِکر و وِرد سے اُن کو دِلی مسرّت اور کیف حاصِل ہوتا تھا۔

ایک دِن موصُوف چارپائی پر بیٹھے ہُوئے باتیں کر رہے تھے مَیں اُن کے سامنے کُرسی پر بیٹھا تھا۔ اُن کا جُوتا زمین پر پڑا تھا۔ جب وُہ بات چیت کر کے اُٹھنے لگے تو مَیں نے جُوتا اُٹھا کر قریب رکھ دِیا۔ مَیں بچّہ تھا، اور اُن کے بیٹے کی برابر تھا۔ وُہ بزرگ تھے۔ اُن کا جُوتا اُٹھاتے ہُوئے میرے ذِہن و دماغ میں کسی قِسم کی ذرا سی بھی کھٹک نہیں ہُوئی، مگر وہ محترم بزرگ میری اِس حرکت پر بڑے سنجیدہ ہو گئے اور وہاں سے ایک دم اُٹھ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد مَیں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں حسبِ معمُول تسبیح لِیے اور نظریں جُھکائے میری طرف آ رہے ہیں۔ مَیں ادب سے کھڑا ہو گیا۔
اُنھوں نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر گلوگیر آواز میں فرمایا ــــــ

"برخوردار! یہ تُم نے کیا کیا۔ سیّد کی اولاد ہوتے ہُوئے، تُم نے میرے جُوتے کو ہاتھ لگایا۔ مَیں اِس لِیے یہاں آیا ہُوں کہ تُم صدقِ دل سے مجھے معاف کر دو۔"

میری عُمر اِس وقت تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ تھی ۔ مرحوم کا سن پچپن سال سے کیا کم ہوگا ۔ مَیں نے عرض کیا کہ آپ میرے بزرگ باپ کی طرح ہیں ۔ مَیں آپ کا خُورد اور بچّہ ہُوں ۔ مَیں اپنے والد کے جُوتے بھی اُٹھا کر دِیا کرتا ہُوں ۔ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں !

میرا ناپختہ ذہن اس وقت اس صُورتِ حال کے سمجھنے سے قاصر تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مَیں کِن لفظوں میں اپنے جذبات کا اِظہار کرُوں کہ قبلہ ! ایسا کرنا تو میری سعادت مندی ہے ۔ اِس بات کی اہمیّت کا مجھے اِحساس کافی عرصے کے بعد ہُوا کہ یہ بزرگ' ذاتِ رسالت مآبؐ سے کِس قدر والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور حضورؐ کی ذات سے قرابت کی نِسبت کو کِتنا مقدّس اور قابلِ احترام سمجھتے تھے ــــــ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ اِس واقعے کے بعد مَیں کوئی چار پانچ دِن وہاں مُقیم رہا، لیکن یہ نیک بزُرگ مجھے یہی کہتے رہے ــــــ

"بیٹا ! مَیں بہت نادم ہُوں ۔ مجھے معاف کردو۔"

گورمانی صاحِب کی مَسیں بھیگ رہی تھیں کہ اُن کے مُشفِق اور محترم والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ۔ دو بھائیوں میں یہی بڑے تھے، اِس لیے انھیں چھوٹے بھائی کی ترِبیت و پرورش اور جائداد کی دیکھ بھال کی مشغولیتوں کے سبب اپنے بے پناہ شوقِ تعلیم سے دستکش ہونا پڑا ۔ یہ جرعہ تلخ تھا' مگر گورمانی صاحِب نے اِسے گوارا کر لیا اور اِس طرح اُن کی تعلیم کا سلسلہ

ختم ہوگیا۔ گورمانی صاحب میں خداداد قابلیت بھی تھی۔ پھر اس سونے پر سہاگہ یہ کہ ان کی جامع صفات والدہ کی شخصیت اور تربیت نے ان کے کردار کی تعمیر کی اور ان کے دل و دماغ میں طلب علم کو زندہ رکھا۔ اس طرح ان کی شخصیت میں آہستہ آہستہ وہ تمام صلاحیتیں جمع ہوتی رہیں، جن کے سہارے ایک آدمی مستقبل میں بڑا آدمی بنتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے اور ٹھیک بتاتی ہے کہ بہت سے بڑے آدمیوں اور نامور شخصیتوں کے بنانے میں آغوشِ مادر نے کارِ نمایاں انجام دیا ہے۔ ماں کی تربیت بچے کی زندگی پر بہت کچھ اثرانداز ہوتی ہے۔ اچھی ماؤں کے بچے عام طور پر اچھے ہی ہوتے ہیں۔ گورمانی صاحب کو یہ سعادت میسّر آئی۔

نواب گورمانی صاحب کے قریبی دوست جانتے ہیں کہ موصوف کتنے معاملہ فہم، پختہ مزاج اور زمانے کے نبض شناس ہیں۔ اُن کی تحریر اور تقریر دونوں مرصّع ہوتی ہیں۔ جب وہ سرکاری عہدے پر فائز تھے تو بڑی بڑی فائلیں پڑھ کر چند لفظوں میں اتنی جچی تُلی رائے کا اظہار فرماتے کہ اُن کے ماتحت حیران رہ جاتے۔ نجی محفلیں ہوں یا عام تقریبیں جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تاریخ کا نہایت اہم باب پڑھ رہے ہیں یا کسی بلند پایہ ادبی و علمی کتاب کا کوئی دلکش اقتباس سُنا رہے ہیں۔ مَیں اکثر اُن سے کہتا رہتا ہوں کہ بھائی! یہ سب

آپ کی والدہ کی تربیت کا فیض ہے۔ گورمانی صاحب خود بھی اِس واقعیت اور حقیقت کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ افسوس ہے، ان بزرگ عفیفہ کا گزشتہ سال انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو منوّر فرمائے۔ (آمین)

وُہ جب تک زندہ رہیں، کراچی میں جب بھی تشریف لائیں، مجھے اپنی شفقت سے محرُوم نہ رکھتیں۔ کسی دِن میرے حاضر ہونے میں کوئی مصروفیت یا مجبوری حائل ہوجاتی تو مجھے دیکھنے کے لیے غریب خانے پر تشریف لائیں اور مجھے دیکھتے ہی فرمائیں:

"میں اپنے بیٹے کے لیے اُداس تھی"۔

میں تعظیم دینے اور خوش آمدید کہنے کے لیے آگے بڑھتا، وُہ نہایت ہی محبّت و شفقت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ اُن کے کرم نہایت اور خلوصِ بے پایاں کا وُہ منظر اب جب بھی یاد آتا ہے تو دل کی عجیب سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ دُعائیں دیتی ہُوئی آتیں اور دُعائیں دیتی ہُوئی واپس ہوتیں۔

نوّاب گورمانی کو بھی یہ عادت ورثے میں مِلی ہے۔ اپنے قدیم شناساؤں اور پُرانے دوستوں سے جیسے وہ شرُوع میں مِلتے تھے، اب بھی اُسی طرح ملتے ہیں۔ زمانے کے گرم و سرد اور دُنیا کے اِنقلابات نے اُن کی دوستی کے پیمانے کو نہیں بدلا۔ احباب کے ساتھ وہ اب بھی بے تکلفی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ دوستوں کی ہنسی مذاق کی باتوں کو

گوارا کرنا اور اُن سے پُورا لُطف اُٹھانا، اِس فن میں وُہ طاق ہیں۔ سنجیدہ گفتگو میں بھی وُہ مزاح و ظرافت کی پُھلجھڑیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وُہ کوئی بات سُنیں اور اُس پر اِستدلال کے ساتھ اپنی رائے کا اِظہار نہ فرمائیں۔ دو ٹوک بات اور مُسکت جواب، اِس میں وُہ مَشّاق ہیں۔ اُن کے بہُت سے جُملے اور لطیفے مجھے یاد ہیں۔

جن دنوں مرکزی حکُومتِ پاکِستان میں وہ وزیر تھے، تو دِن میں اکٹھے کھانا کھانے کا ہمارا معمُول تھا۔ کھانا کھاتے میں مُختلف موضُوعات پر تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا۔ خواجہ ناظِمُ الدین مرحُوم اُن دِنوں وزیرِ اعظم تھے اور مُلک متعدّد اہم اور نازک مسائل سے دو چار تھا۔ ایک دِن میں نے ایک مسئلے پر گفتگو کرتے ہُوئے بڑی سخت تنقید کر ڈالی۔ نوّاب گورمانی بڑے تحمّل کے ساتھ سُنتے رہے۔ غُصّہ اُنھیں بہُت کم آتا ہے، مگر اُس دِن قدرے دِل گرفتہ انداز اور برہمی آمیز لہجے میں بولے ——

"وحید! یہ بتاؤ، تم میں اور دُشمن میں کیا فرق ہے؟"

مَیں نے جواب میں کہا، بہُت فرق ہے۔ دُشمن چاہتا ہے پاکستان نہ رہے۔ مَیں چاہتا ہُوں، موجُودہ حکُومت تبدیل ہو جائے اور مُلک کو بہتر اور مضبوط حکُومت میسّر آ جائے۔

مَیں نے یہ بھی کہا، اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ مُلک و قوم کی بہتری کے لیے موجُودہ حکُومت تبدیل ہو جائے اور اُس کی

جگہ زیادہ فعّال اور بہتر حکومت آجائے تو یہ سوچنا دوستی ہوگی، دشمنی نہیں ہوسکتی۔ مَیں نے عرض کیا، اچھّی حکومت وہی ہے، جو مُلک کے مسائل سے حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوسکے اور اُس کی کوشش کی بدولت ایک اچھّا معاشرہ وجود میں آجائے۔

نواب مشتاق احمد گورمانی کے متعلق میرے یہ تاثرات بالکل ذاتی نوعیت کے ہیں۔ اُن کی زندگی کا یہ پہلو بڑا سبق آموز ہے کہ اُنھوں نے انتہائی ناسازگار حالات میں صرف اپنی ذہانت، دانش اور حکمتِ عملی کے سبب ترقّی کے اعلیٰ مدارج طے کیے۔

○
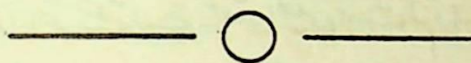
فیض احمد فیضؔ

فیض احمد فیضؔ اچھّے دوست، اچھّے انسان اور قابلِ ذکر دانشور کی حیثیت سے ہر کہیں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی شخصیت پر ایک مقالہ خاصی تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں، جو ماہنامہ "افکار" کے "فیض نمبر" میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اُن کے سوانحِ حیات بیان کرنا مقصود نہیں، اپنے ذاتی تاثرات کا ایک خاکہ پیش کر رہا ہوں۔

فیضؔ کے ساتھ میرے نیاز مندانہ روابط اور دوستانہ مراسم اب بیس سال سے بھی پُرانے ہو چکے ہیں۔ اِن تعلقات کا آغاز دہلی میں ہوا جب میں بھی محکمۂ فوج میں عہدیدار تھا اور فیضؔ صاحب بھی۔ میرے اور اُن کے درمیان تعارف کا واسطہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی ذات تھی۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا اور یہ سلسلہ اُس وقت بھی قائم رہا جب فیضؔ لاہور واپس آ گئے۔ میں نے اُنھیں ہمیشہ عزیز ترین دوست سمجھا اور اُنھوں

نے دوستی کو ہمیشہ اسی خلوص و محبّت کے ساتھ نباہا ——— !

فیضؔ کی ذات، ذہانت، قابلیت اور تخلیقی صلاحیتوں کا مجموعہ ہے جس کا مجھے خود بارہا مواقع پر تجربہ ہو چکا ہے۔ اُن کی فکر اور تحریر میں Originality کا یہ رنگ کمسنی ہی سے موجود تھا۔ اُن کا شمار جماعت کے ہونہار طلباء میں ہوتا۔ فارسی اور عربی سے انگریزی کی طرح اُنھیں شغف تھا۔ شعر گوئی کا جوہر اُسی زمانے میں نمایاں ہونے لگا تھا اور ان کی پیشانی سے ——— می تافت ستارۂ بلندی ——— کا اظہار!

میرے دوست پروفیسر یوسف سلیم چشتی فرماتے ہیں کہ ۱۹۲۸ء میں مرے کالج سیالکوٹ میں فیضؔ نام کا ایک متین و ذہین لڑکا فرسٹ ایئر میں اُن کا شاگرد تھا۔ یہ لڑکا اپنی شرافت، سنجیدگی، بردباری، کم آمیزی اور رکھ رکھاؤ کے سبب میری کلاس میں ممتاز تھا۔ اکتوبر میں جب کالج میں Tutorial Groups بنے تو حُسنِ اتّفاق سے یہ نوجوان چشتی صاحب کے گروپ میں شامل تھا۔ چشتی صاحب نے فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اس گروپ کا نام "اِخوانُ الصّفا" رکھّا۔ طے پایا کہ اخوان الصّفا کے زیرِ اہتمام ہر مہینے شعر و سخن کی نشست بھی ہُوا کرے۔ پہلی بزمِ سخن کے لیے یہ مصرعۂ طرح تجویز ہُوا ———

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا

اِس مشاعرے میں مذکورہ طالب علم نے جس کی عمر بمشکل سولہ سال

کی ہوگی، ایک غزل پڑھی، جس کا ایک شعر یہ تھا ـــــ

لب بند ہیں ساقی مری آنکھوں کو پلا دے

وہ جام جو منّت کشِ صہبا نہیں ہوتا!

اس کم عمری میں اور ایسا شعر ـــــ چشتی صاحب بہت مُتاثر ہُوئے اور اُنھوں نے فیض صاحب کے ایک ہم جماعت طالب علم رحمت اللہ بیدل سے کہا ـــــ

"اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور اسی طرح مشقِ سخن کرتا رہا تو ایک دن اس کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوگا ـــــ"

چشتی صاحب کی اِس پیش گوئی کو اب ۲۷ سال ہو چکے ہیں اور آج واقعی فیض کا شمار نہ صرف پاک و ہند کے مشہور دانشوروں میں کیا جاتا ہے، بلکہ اپریل ۱۹۶۲ء میں اُنھیں رُوس کا سب سے بڑا اعزاز "لینن پرائز" بھی مِل چکا ہے ـــــ اس سے پہلے بین الاقوامی اہمیت کا یہ پرائز دُنیا کی بعض اہم شخصیتوں کو مِل چکا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُنھوں نے عالمی بقائے امن کے لیے نمایاں جدّ و جہد کی ہے ـــــ اس طرح فیض بین الاقوامی شہرت کے مالک ہو چکے ہیں اور اُن کی شہرت خوشبو بن کر ہر کہیں پھیل رہی ہے۔

فیضؔ لاہور سے نقلِ سکونت کر کے کراچی کو مستقل اقامت گاہ بنا چکے ہیں اور آج کل سر عبد اللہ ہارون کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ ایک ہر دلعزیز شاعر اور بلند پایہ دانشور ہیں، اس لیے ثقافتی سرگرمیوں، علمی مجلسوں اور شعر و ادب کی محفلوں کی رُوح رواں ہیں —— اُن کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز جو میں اپنے طویل تجربے اور ذاتی مشاہدے کی بنا پر بیان کر سکتا ہُوں، یہ ہے کہ وہ ایک مستقل مزاج، صاحبِ کردار، خود دار اور اصُولوں کے معاملے میں بے لچک شخصیت ہیں۔ مصلحتوں اور منفعتوں کے لیے عزّتِ نفس کی سودے بازی اُنھوں نے نہیں سیکھی۔ یہ اُن کا مزاج ہی نہیں ہے۔

فیضؔ کے پاس بیٹھ کر اُن کی گفتگو سُننا اور خود اُن کے چہرے اور حرکات و سکنات کا مطالعہ کرنا ایک ہی جیسی بات ہے۔ مُوڈ میں ہوں تو دُشوار مسائل اور مشکل افکار کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ سُبک خرام، شگفتہ کلام —— جو کچھ کہتے ہیں، بہت خود اعتمادی اور پختہ یقین کے ساتھ نپے تُلے انداز میں —— جو لوگ پہلی بار فیضؔ سے مِلتے ہیں، اُن کی کم آمیزی سے غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ فیضؔ اور کبر و نخوت دو متضاد باتیں ہیں۔ اُن کی کسرِ نفسی اور بے نیازی کا رنگ راقم الحرُوف جیسے لوگ ہی جانتے

ہیں جو فیضؔ سے قریب رہے ہیں اور اُن کو قریب تر ہو کر دیکھا ہے۔ وہ خاموش اور متین و سنجیدہ انسان ہیں مگر جہاں بین و جہاں دیدہ ــــــ میں نے اُنھیں جب بھی دیکھا، کچھ سوچتے ہوئے پایا ــــــ تفکّر و تعمّق اُن کا مزاج بن گیا ہے۔

فیضؔ بڑے وسیعُ النّظر اور صاحبِ ظرف انسان ہیں۔ زمانے کی اُفتاد، واقعات کی ناخوشگواری اور روزگار کی نامساعدت کا اُن کے ذہن و فِکر پر کوئی منفی اثر نہیں ہوتا، آزمائشوں اور مصائب و آلام کو اُنھوں نے اِس سے زیادہ شاید ہی سمجھا ہو کہ ــــــ

جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

اپنی ذات کے بارے میں یہ بے نیازی، مگر دُوسروں کے دُکھ درد کے لیے اپنے پہلو میں دلِ دردمند رکھتے ہیں۔

وہ ایک لائق معلّم ہونے کے علاوہ بلند پایہ صحافی بھی ہیں۔ انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" نے اُن کے زمانۂ ادارت میں صحافت کے نئے تجربے کیے اور جرنلزم کو نئے خطُوط اور نئے انداز پر استوار کیا۔ اُنھوں نے جِتنے دن صحافت سے اپنا تعلّق رکھا، اخلاقی جرأت، بے باکی و بے خوفی اور حق گوئی کی چٹان بن کر رہے۔ مصلحت کوشی، چاپلوسی اور قصیدہ خوانی سے اُنھیں ہمیشہ اجتناب رہا ــــــ میں اُن کے قریبی دوست کی حیثیت سے اُن کی اِس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے

بڑا فخر محسوس کر رہا ہُوں ــــــ کہ فیضؔ نے نظریاتی یا عملی اعتبار سے ہوا کے رُخ پر بادبان کھولنے کی رسم کبھی قبول کی نہ اسے رواج دیا ــــــ

فیضؔ علّامہ اقبال کے بڑے مدّاح ہیں۔ اُنھیں علّامہ کے شفیق و محترم اُستاد مولوی میر حسن سے درس لینے کا فخر بھی حاصل ہے۔ علّامہ کی شاعری اور افکار و خیالات پر اُن کے جو محسوسات سُننے اور جاننے کا اِتّفاق ہُوا ہے، اُن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، البتّہ ایک بار گفتگو کے مُوڈ میں اپنی جس وقیع رائے کا اظہار کیا تھا، اُس کا ذکر مناسب سمجھتا ہُوں۔ فیضؔ نے کہا ــــــ

> "میں نے فارسی میں ایک شاعر حافظؔ کو ٹھیک سے پڑھا ہے۔ اُردُو میں میرؔ اور غالبؔ کو۔ رہا اقبالؔ ــــــ تو وہ ایسا شاعر ہے کہ اُسے پڑھتے وقت کوئی اور شاعر نظر میں نہیں جچتا۔ محسوس ہوتا ہے جیسے شاعر بس وہی ہیں۔ فکر اور شعر دونوں میں ہمہ گیر اور آفاقی!"

اُنھوں نے میرؔ و غالبؔ کے اپنے پسندیدہ اشعار بھی سُنائے آپ بھی لُطف اُٹھائیے ــــــ

وصل و ہجراں کی جو دو منزل ہیں راہِ عشق میں
دل غریب اُن میں، خدا جانے، کہاں مارا گیا

اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابلِ سیر
صنم کدے میں تو ٹک آکے دل لگا بھی ہے
(میرؔ)

اور یہ ہیں غالبؔ کے اشعار ——

دردِ دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دِکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خُونچکاں اپنا

وفائے دلبری ہے اتّفاقی ورنہ اے ہمدم!
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

فیض احمد فیضؔ ایک مقبول شاعر ہونے کے علاوہ صاحبِ طرز
انشاء پرداز اور مشّاق ادیب و صحافی بھی ہیں۔ ان کی انگریزی اور اردو
تحریروں میں بڑی روانی، سلاست اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ تخئیل
اور اظہار میں اُن کے یہاں نُدرت اور جدّت ملتی ہے۔ اُن کی نگارشات
میں جو اچھوتا پن (Originality) موجود ہے، وہی ان کی تحریر و انشاء

کا سب سے زیادہ نمایاں وصف ہے۔

۱۹۵۰ء میں جب شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی ذات اور شخصیت سے متعلق میری یادداشتوں کا مجموعہ ("روزگارِ فقیر"، نقشِ اوّل) مکمل ہُوا تو میں اِس مجموعے کو بہاوَل پور سے اپنے دوست فیض احمد فیض کے پاس لاہور لے کر گیا۔ عزیزی اقبال احمد صدّیقی جنھوں نے میری کاروباری مصروفیتوں کے زمانے میں یہ یادداشتیں مجھ سے سُن سُن کر بڑی محنت اور کوشش سے جمع کی تھیں، اِس سفر میں میرے ہمراہ تھے۔ اُس وقت تک کتاب کا نام تجویز نہیں ہُوا تھا۔ فیض اُن دنوں پاکستان ٹائمز کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ میں اُسی شام اُن کے دفتر پہنچا۔ فیض اور میاں اِفتخارُالدّین سے مُلاقات ہُوئی۔ سلام دُعا کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مزاج پُرسی کے سلسلے میں برادرانہ خلوص کا اِظہار، صحت کی کیفیتوں کا تبادلہ، کاروباری حالات کیسے ہیں؟ یہ باتیں ہو چکیں تو میں نے وہ مقصد بیان کیا، جس کے لیے میں آیا تھا۔

"بھائی فیض! علامہ اقبالؒ کے متعلّق میں نے یہ یادداشتیں کتابی صُورت میں مرتّب کی ہیں۔ اِس کتاب کی عبارت کو ایک نظر آپ دیکھ لیں، ساتھ ہی کتاب کا کوئی اچھا سا موزُوں نام بھی تجویز فرما دیں

اور اس کی طباعت کا انتظام بھی آپ ہی کو کرنا ہے ــــ"

فیض صاحب نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مسوّدہ میرے ہاتھ سے لیا اور اِدھر اُدھر سے اوراق اُلٹ پلٹ کر دیکھے، پھر کہا ــــ

"آپ مسوّدہ چھوڑ جائیے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

فیض صاحب بات کو طُول دینے کے عادی نہیں ہیں۔ مُختصر سے مُختصر الفاظ میں بڑے سے بڑے مفہُوم کو ادا کر دینا اُن کا معمُول ہے۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہُوں کہ "پاکستان ٹائمز" اخبار اور پریس کے مالک میاں افتخارُالدّین مرحُوم سے میرے دیرینہ خاندانی تعلّقات تھے اور بڑی گہری دوستی و بے تکلّفی تھی۔ اُنھوں نے جب اس کتاب کا حال سُنا تو بہت خوش ہُوئے، بلکہ فرطِ مُسرّت میں خُود کہا۔

"بھائی وحید! تمھاری کتاب میری نگرانی میں چھپے گی اور ایسی شاندار چھپے گی کہ گٹ اپ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہو گی۔"

میں نے اُن کا پیشگی شکریہ ادا کیا اور واپس جانے کے لیے اجازت چاہی۔ اگلے دن ہم فیضؔ سے اُن کی قیام گاہ پر ملنے کے بعد واپس ہوئے تو فیضؔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے آئے۔ جب ہم تینوں درمیانی سیڑھیوں تک پہنچے تو فیضؔ نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ

"لیجیے، آپ کی کتاب کا نام تو ذہن میں آ گیا۔

اِس کا نام ــــ "روزگارِ فقیر" ــــ ہونا چاہیے۔"

فیضؔ کی زبان سے یہ نام سُن کر میرا خیال فوراً علامہ اقبالؒ کے اِس مشہور قطعے کی طرف مبذول ہو گیا ــــ

سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

میں یہ نام سُنتے ہی خوشی سے وارفتہ سا ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر فیضؔ کو گلے سے لگایا اور کہا کہ تم نے یہ نام تجویز کر کے مجھے زندگی کی ایسی متاع دی ہے، جس کی نہ تو کوئی قیمت ہو سکتی ہے اور نہ کوئی جواب!

فیضؔ سے رُخصت ہو کر جب میں اور اقبال صدّیقی موٹر میں سوار ہوئے تو اقبال نے تعجّب کے انداز میں کہا ــــ

”دیکھیے صاحب! سینکڑوں بار یہ قطعہ پڑھا اور سُنا لیکن اس کا کبھی خیال نہیں آیا کہ اس قطعے سے ایسا خوب صُورت اور بامعنی نام مل سکتا ہے جو کتاب سے بھی معنوی طور پر مناسبت رکھتا ہو اور خاندانی نام اور لقب کی رعایت بھی اس میں موجُود ہو ——“

اس بات چیت کے بعد میں بہاول پور واپس چلا گیا اور اقبال صدّیقی کو کتاب کی کتابت و طباعت کے مرحلوں کو طے کرنے کے لیے لاہور چھوڑ گیا۔ فیض احمد فیضؔ اور اُن کے رفیقِ کار چراغ حسن حسرت نے، جو روزنامہ ”امروز“ کے ایڈیٹر تھے، اپنے ایک ماتحت خطّاط کو کتابت کے لیے منتخب کیا۔ کتابت ہوتی رہی اور مجھے اطلاع ملتی رہی کہ کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ جب کتاب کے بڑے حصّے کی کتابت ہو چکی تو میں نے فیضؔ کو پیغام بھیجا کہ جس کتاب کا نام اُنھوں نے تجویز کیا ہے، اُس پر ’پیش لفظ‘ بھی وہی لکھ دیں۔

فیضؔ نے اقبال صدّیقی کو جواب دیا ——

”ہاں، یہ کام ہو جائے گا۔ تم ایک دو دن میں مجھ سے مل لینا ——“

اس کے بعد کیا ہُوا —— ؟ یہ دلچسپ واقعہ خود اقبال صدّیقی کی زبانی سُنیے:

”میں دو دن کے بعد ”پاکستان ٹائمز“ کے

دفتر میں پہنچا تو فیضؔ صاحب کچھ لکھنے میں محو تھے۔
چائے کی پیالی سامنے رکھی تھی اور ہونٹوں میں
سگریٹ تھی ــــ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بیٹھنے
کے لیے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا ــــ
پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے ــــ

"ذرا یہ کام مکمّل ہو جائے تو تعارُف بھی
لکھیں گے۔"

فیضؔ صاحب سگریٹ نوشی کے معاملے میں
ہمیشہ Chain Smoker رہے ہیں۔ سگریٹ سے
سگریٹ سُلگائے چلے جاتے ہیں۔ جیسے دُھوئیں اُڑانا
اُن کی Hobby ہو۔ اسی طرح چائے کا کپ بھی
اکثر و بیشتر اُن کے سامنے رہتا ہے۔ سگریٹ اور چائے
ــــ چائے اور سگریٹ ــــ یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں
پاتا۔ فیضؔ صاحب لکھتے رہے۔ سگریٹ کا دُھواں
فضا میں تحلیل ہوتا رہا اور وقت گزرتا رہا ــــ جب
کام ختم ہو چکا تو اُنھوں نے زیرِ لب مُسکرا کر کہا ــــ

"بھئی! اب تو کافی دیر ہو گئی۔ چلو، کل
ٹھیک رہے گا۔"

میں دُوسرے دن اُن کے دفتر پہنچا تو فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" کا اداریہ لکھ رہے تھے۔ میں خاموشی سے اُن کے سامنے کُرسی پر بیٹھ گیا اور وہ معمول کے مطابق چائے پیتے اور سگریٹ کا دُھواں فضا میں اُڑاتے رہے۔ اُنھوں نے جیسے ہی اداریہ ختم کیا، میں فوراً بول پڑا ——— "روزگارِ فقیر" کے مضامین کی کتابت مکمّل ہو چکی ہے۔ تصحیح بھی ہو چکی۔ اب بس آپ کے تعارف نامے کے انتظار میں سارا کام رُکا ہُوا ہے ——— فیضؔ صاحب حسبِ عادت مُسکرائے اور ابھی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اُنھوں نے ریسیور اُٹھایا اور ———

"نہیں، مشکل ہے۔"

کہہ کر رکھ دیا۔ میرا قیاس یہ ہے کہ کسی مشاعرے یا ادبی مجلس میں شرکت کی دعوت کے جواب میں اُنھوں نے یہ کہا ——— اِتنے میں کچھ غیر مُلکی مہمان اُن سے ملنے کے لیے آ گئے ——— فیضؔ صاحب نے میری طرف دیکھا اور بڑی شفقت کے لہجے میں فرمایا:

"اقبال! تعارف تو کل ہی کو لکھیں گے۔

شام کو ضرور آجاؤ"۔

وہ جس خوش مزاجی اور سادگی کے انداز میں یہ وعدہ کر رہے تھے، اُس پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور میں شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔

جب اسی طرح دس بارہ دِن گزر گئے کہ میں روزانہ جاتا اور گھنٹہ دو گھنٹہ فیض صاحب کے پاس بیٹھ کر ناکام واپس چلا آتا تو میرے ذہن میں خود بخود ایک خیال اُبھرا ـــــــ یہ کہ فیض صاحب صبح سے لے کر شام تک انگریزی سے واسطہ رکھتے ہیں۔ اداریہ انگریزی میں، خبریں انگریزی میں، کارٹونوں کی عبارت بھی انگریزی میں۔ جن کتابوں اور اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، وہ بھی زیادہ تر انگریزی ہوتے ہیں، اس لیے غالباً اردو مقالہ لکھنے میں اُنھیں تکلف اور دُشواری پیش آرہی ہے۔ نہ جانے مجھے کتنے دن اور انتظار کرنا پڑے گا ـــــــ

جہاں تک مجھے یاد ہے فیض صاحب کے دفتر میں حاضری کا یہ بارھواں دِن تھا۔ میں سرِ شام

اُن کے دفتر پہنچا۔ اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا:
"آؤ بھئی! آج ضرور لکھیں گے۔"
چند منٹ کے بعد فیض صاحب نے کاغذ کی ایک سلپ اُٹھا کر اپنے سامنے رکھّی اور لکھنا شروع کر دیا ــــ میں خوش بلکہ مطمئن ہو کر ہمہ تن اُن کی طرف متوجّہ ہو گیا ــــ میری نگاہیں اُن کے قلم کی تیزی اور روانی پر جمی ہُوئی تھیں، جو کسی وقفے کے بغیر مسلسل جنبش میں تھا۔ ذرا سی دیر میں ایک سلپ لکھ کر مجھے دے دی اور دُوسری سلپ لکھنا شروع کر دی۔ اُنھوں نے سگریٹ مُنہ میں دبا رکھّی تھی۔ کبھی کبھار اُسے ہونٹوں سے نکال کر ایش ٹرے پر جھٹک دیتے۔ میں اُن کے لکھے ہُوئے صفحات کو پڑھتا جاتا اور اردو زبان پر اُن کی قدرت اور تحریر کی روانی و شستگی کا دل ہی دل میں معترف ہوتا جاتا
اُنھوں نے پندرہ صفحے اِس طرح مکمّل کیے کہ نہ تو کسی صفحے کو دوبارہ لکھا، نہ کوئی فقرہ یا پیراگراف تبدیل کیا اور نہ کسی لفظ کو کاٹا، نہ کسی جُملے میں کوئی اِضافہ کیا۔ خود اِعتمادی کا یہ عالم کہ جو ایک دفعہ

لکھ دیا، گویا وُہی حرفِ آخر تھا ——"

فیضؔ صاحب کا یہ "تعارُف" شامِل کتاب ہُوا تو متعدّد تبصرہ نگاروں نے اسے زبان و ادب کا شاہکار قرار دیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لحاظ سے اِس مقالے کا ایک اقتباس درجِ ذیل کیا جاتا ہے:

"روزگارِ فقیر" —— حیاتِ اقبال کا جامع تذکرہ نہیں ہے۔ اِس میں شاعرِ مشرق کی شخصیت یا اس شخصیت کے کسی پہلُو کا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ اِس کی نوعیّت ایک سیاح کی ڈائری کی سی ہے جو کبھی کسی دلکش وادی میں سے گزرا ہو اور کئی برس بعد فرصت کے اوقات میں اِس حسین سفر کی بِسری ہُوئی یادوں کی شیرازہ بندی کرنا چاہے —— کسی دلفریب صبح کی ایک جھلک، کسی دلکش شام کا ایک منظر، ہوا میں اُڑتا ہُوا ایک خزاں رسیدہ پتّہ یا جنگل میں سر جوڑے ہُوئے ہزاروں تناور درخت، گھاس پر جگمگاتا ہُوا شبنم کا اکلوتا موتی یا شفق میں ڈوبی ہُوئی کوئی وسیع اور ذخّار جھیل، چھوٹی اور بڑی باتیں، فطرت کے حقیر اور عظیم مناظر، واضح مبہم نیم مبہم یادیں —— ! جو بھی سیّاح کے ذہن میں

محفوظ ہے، اُس نے بلا کم و کاست لکھ دیا ہے۔ ان نگارشات
کا تسلسل اُس کی اپنی یاد کا تسلسل ہے۔ یاد ہی کی
دُھوپ چھاؤں میں مصنّف کے ممدُوح کے نقوش
کبھی دُھندلے کبھی روشن دکھائی دیتے ہیں۔
اگر ایک سیّاح کی ڈائری کی بجائے یہ کتاب
سائنس داں کا تحقیقی مقالہ ہوتا تو ہم اس میں یقیناً
جمادات اور نباتات کے تفصیلی بیان کی توقع کرتے۔
اس میں معدنیات کے ذخائر کا ذکر ہوتا۔ دریاؤں،
لہروں، چشموں اور جھیلوں کی تفصیل ملتی۔ غرض،
سائنس داں ہر ذرہ اور پتّہ کا دل چیر کر ہمیں دکھاتا!
—— لیکن سیّاح کا یہ کام نہیں ہے۔ اس کی
تصنیف کا حُسن اور سُود مندی محض اُس کے اپنے
تاثّرات کے خلُوص اور صحت پر منحصر ہے۔ "روزگارِ فقیر"
میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجُود ہیں ——"

اِن سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیضؔ نے ذاتی دوستی کے باوجود
ایک اچھے نقّاد اور مبصّر کے فرائض کس خوش اسلوبی سے ادا کیے
اردو کے اِس اقتباس کے بعد اُن کی انگریزی قوّتِ تحریر اور اندازِ بیان
میں نُدرت کا تذکرہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ——

گزشتہ سال میں نے رسُولِ مقبُول صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت اور خلفائے راشدینؓ کے مقدّس حالات پر اپنی کتاب "محسنِ اعظمؐ اور محسنینؓ" کے انگریزی ترجمے کے سلسلے میں اُن سے مشورہ کیا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ اِس کتاب کو انگریزی میں اس طرح منتقل کریں کہ ترجمہ لفظی نہ ہو ____ بلکہ اِس کتاب کی ترتیب و تصنیف میں جو اصل مقصد اور رُوح کارفرما ہے، وہ انگریزی قالب میں منتقل ہو جائے۔ اُنھوں نے برادرانہ خلوص کے ساتھ اِس عظیم و مقدّس کام کو مکمل کرنے کا وعدہ کیا۔ حُسنِ اتّفاق یہ کہ وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو چکے تھے، اس لیے یہ اور بھی سہُولت کی بات تھی۔ مجھے ہر طرح کا اِطمینان ہو گیا۔

اِس وعدے کے کچھ دِن بعد اُن سے ملاقات ہُوئی تو میں نے ترجمے کا ذکر کیا۔ کہنے لگے: ابھی شرُوع نہیں کیا۔ کتاب پڑھنے میں کافی دِن لگ گئے۔ خوب سمجھ کر اور غور سے پڑھی ہے۔ اب یہ طے کرنا باقی ہے کہ مصنّف یا مترجم کے مخاطب کس سطح کے لوگ ہیں۔ یعنی بچے ہیں، نوجوان ہیں یا سن رسیدہ لوگ ہیں۔ چونکہ قارئین جس استعداد اور ذہنی سطح کے ہوں گے، زبان اور خطاب کا انداز بھی اُسی ذہنی سطح کے مطابق ہونا چاہیے ____

میں نے فیضؔ کے اِس زاویۂ نگاہ کی بہت تعریف کی۔ اُن کی یہ بات راقم الحرُوف کے دل میں اُتر گئی۔ اِس بات کو جب کئی

مہینے گزر گئے تو میں نے ترجمے کا ذکر چھیڑا اور پھر یاد دہانی کرائی۔ اگرچہ وہ بہت سا کام کر چکے تھے، لیکن جو باقی تھا اُس کے جلد ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے اِس بات کا بھی بخُوبی اندازہ تھا کہ وہ طبعاً سُست واقع ہُوئے ہیں اور بعض اوقات معمُولی کام بھی اُن کی اِس عادت اور بے نیازی کی وجہ سے ادھورے رہ جاتے ہیں یا معرضِ التوا میں پڑے رہتے ہیں۔ اِس لیے میں نے اُن کی بیگم —— ایلیس فیض سے، جو ایک نہایت ہی ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز خاتُون ہیں، مشورہ کیا —— اِس روشن خیال خاتُون کی بعض خوبیوں سے میں بہت ہی متاثر رہا ہُوں۔ وہ معاملاتِ زندگی میں اپنے حد درجہ بے نیاز شوہر کے سکُون و آرام کا بہُت ہی خیال رکھتی ہیں اور اُن کی پُوری طرح مزاج شناس ہیں۔ فیض کے لیے اُنھوں نے ایسا گھریلُو سکُون اور سازگار فضا پیدا کر رکھی ہے جو ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر کے لیے بہُت ضروری ہے۔ کئی بار مشاہدے میں آیا ہے کہ کتنی ہی شخصیّتیں قابلیّت کے اعلیٰ جوہر رکھنے کے باوجود محض گھریلُو انتشار اور پراگندگی کے ہاتھوں گُم نام اور برباد ہو کر رہ گئیں!

معاش و روزگار کی ذمّہ داری قُدرت نے شوہر ہی پر ڈالی ہے۔ فیض بھی اس کے ذمّہ دار ہیں، مگر اُن کی بیگم نے فیض پر گھریلُو ذمّہ داریوں کا ایسا بار نہیں ڈالا جو اُن کی تخلیقی اور فکری صلاحیتوں کو

دبا دے یا اُن کی راہ میں رُکاوٹ ثابت ہو۔ وہ نہ صرف فیضؔ کے مضامین و مسوّدات میں گہری دلچسپی لیتی ہیں بلکہ اُنھیں خود ٹائپ بھی کر دیتی ہیں۔ بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان لفظ، زبان و محاورہ اور اِصطلاحات کے بارے میں بڑی دلچسپ بحث چھِڑ جاتی ہے۔

گفتگو کے بعد طے پایا کہ فیضؔ صاحب انگریزی ترجمے کا کام راقم الحروف کی قیام گاہ پر مکمّل کریں۔ چنانچہ ہر روز دوپہر کو میں عبداللہ ہارُون کالج اپنی گاڑی بھیج دیتا اور ایک بجے تک فیضؔ صاحب میرے پاس آجاتے —— یہاں آنے کے بعد وہ ایک الگ تھلگ بند کمرے میں بیٹھ کر اپنا کام کرتے رہتے —— یہ دیکھنے میں تو ایک طرح کی قیدِ تنہائی تھی، لیکن یہاں جو مبارک کام ہو رہا تھا، اُس کی نسبت سے ہزار آزادیوں کے لیے قابلِ رشک بن گئی تھی ——

مس ایلیسؔ فیض اُن کے اس معمول سے بہت خوش تھیں اور میں اپنی جگہ مطمئن کہ یہ طائرِ آزاد اس قفس میں اِس مقدّس کام کو ختم کر کے ہی دم لے گا۔ ایک روز فیضؔ نہ آئے تو میں نے اُن کے گھر ٹیلیفون کیا۔ مِسز فیض نے کہا؛ وہ سینما گئے ہیں۔ میں نے جواب دیا —— بہن! آپ فیضؔ کو سینما بھیج کر پیسے ضائع نہ کیا کریں، چونکہ جسمانی طور پر تو وہ سینما ہال میں ہوں گے، مگر اُن کا دماغ کہیں

اور ہو گا ـــــ ! ایلس فیض اپنے شوہر کے متعلق اس رائے پر دیر تک ہنستی رہیں۔

مجھے خدشہ تھا کہ معمول میں فرق آ گیا ہے۔ دیکھیے، دُوسرے دن کیا رہتا ہے؟ مگر میرا اندیشہ غلط ثابت ہُوا۔ فیضؔ صاحب معمول کے مطابق آ گئے اور آٹھ دس دِن میں ترجمہ مکمّل ہو گیا ـــــ

"محسنِ اعظم اور محسنینؓ" کا انگریزی ترجمہ جب "The Benefactor" کے نام سے شائع ہُوا تو ہر طرف دُھوم مچ گئی، مُلک میں بھی اور مُلک سے باہر بھی! اس ترجمے کو تعلیم یافتہ اور اہلِ نظر نے نہ صرف پسند کیا بلکہ اس کی بڑی تعریفیں کیں اور طرح طرح سے سراہا۔

فیضؔ صاحب کے انگریزی ترجمے کا مسوّدہ اپنے تمام کاغذات کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے اس ترجمے کو بار بار پڑھا ہے۔ میں پُوری ذمّہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہُوں کہ فیضؔ یقیناً پاکستان کے اُن چند گنے چُنے لوگوں میں سے ہیں جو انگریزی زبان پر غیر معمُولی قدرت اور عبُور رکھتے ہیں۔ بعض مقامات پر اُن کا ترجمہ پڑھتے ہوئے ایسا محسُوس ہوتا ہے کہ یہ عبارت کسی مشّاق انگریز ادیب کے قلم سے نکلی ہُوئی ہے۔ ایسی روانی اور بے تکلّفی تو اہلِ زبان ہی کا حصّہ ہے۔

اس تمام مسوّدے میں ایک لفظ، ایک سطر یا ایک پیراگراف

بھی ایسا نہیں ہے جس پر دوبارہ قلم لگانے کی نوبت آئی ہو — وہ ایک بار انتہائی روانی میں جو کچھ لکھ گئے ہیں، اُسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

مشہور انگریز مصنّف ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon)، جس نے سلطنتِ روم پر اپنی معرکہ آرا کتاب (The Decline and Fall of The Roman Empire) آٹھ جلدوں میں لکھ کر انگریزی زبان پر احسان کیا ہے اور تاریخ میں اپنے آپ کو زندۂ جاوید کر لیا ہے، کتاب کے آغاز میں رقمطراز ہے کہ —

> "میں نے اس کتاب کے مسوّدے کو لکھتے ہوئے اس پر نظرِ ثانی نہیں کی، بلکہ جیسے ہی میں صفحات لکھ کر مکمّل کرتا تھا، اُنھیں پریس بھیج دیا جاتا تھا —"

اس کتاب کو پڑھتے وقت گبن کی غیر معمولی قابلیّت کے علاوہ یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ خُدا نے اس شخص کو کس قدر روشن دماغ، یادداشت اور خود اعتمادی عطا کی تھی، جس کی بدولت وہ یہ علمی خزانہ نسلوں کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ میں نے گبن (Gibbon) کے اس واقعے کو پڑھا تھا، لیکن فیضؔ کی قابلیّت اور تحریر میں خود اعتمادی دیکھ کر اس کا ذاتی تجربہ بھی ہو گیا۔

فیضؔ صاحب کو عربی، انگریزی اور اردو زبانوں پر جس قدر عبور ہے، اُس کے پیشِ نظر میں نے اُن سے وعدہ لیا ہے کہ زندگی نے وفا کی تو اُن سے دینی اہمیت کا ایک اور شاندار کام لیا جائے گا ــــــ انسانی تمنّاؤں کا کیا پوچھنا، لیکن ان کی تکمیل اللہ تعالےٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر مشاہیر اور اہلِ کمال کی قدر افزائی اُس وقت کی جاتی ہے، جب وہ ہمارے درمیان سے اُٹھ جاتے ہیں ــــــ یہ ایک بُری روایت اور اظہارِ عقیدت کا غلط طریقہ ہے ــــــ فیضؔ واقعی اِس قابل ہیں کہ اُن کی زندگی ہی میں اُن کی قدر کی جائے اور ہمارے نوجوان اُن کی قابلیت، ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں سے اِستفادہ کریں ــــــ!

ــــــــ ○ ــــــــ
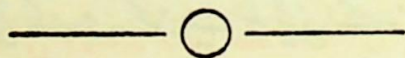
مِس فنائِسن

سیّدہ محبُوب بیگم کے واقعات میں مِسز خورشِید کا ذکر آچکا ہے۔ سماجی فلاح و بہبُود کے کاموں سے اُن کو خاص دلچسپی اور بڑا گہرا شغف رہا ہے۔ اُن کی اِسی دِلچسپی کے سبب مجھے انسانی ہمدردی اور ناداروں کی اعانت و دستگیری کے معاملے کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا موقع مِلا۔ مَیں جس واقعے کی طرف یہاں اشارہ کر رہا ہُوں وُہ اُس زمانے سے متعلّق ہے۔ جب میرے مُحترم دوست ایم۔ خورشید لاہور میں صُوبائی حکومت کے چیف سیکرٹیری تھے۔ مسز خورشید بھی اپنے شریکِ حیات کے ہمراہ تھیں۔ ایک دِن اُنھوں نے مُجھ سے کہا؛ آئیے میرے ساتھ چلیے۔ مَیں آپ کو نابینا بچّوں کا ایک اسکُول دکھاؤں، تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ سوسائٹی کا یہ طبقہ کس قدر ہمدردی اور توجّہ کا مستحق ہے۔ مَیں اُن کے ساتھ چلنے کے لیے خوشی کے ساتھ

تیار ہو گیا اور ہم دونوں تھوڑی دیر میں بڈھے دریا کے کنارے ایک نہایت ہی بوسیدہ عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔

یہی عمارت نابینا بچوں کا اسکول تھا اور اُن کی رہائش گاہ بھی!

مسز خورشید نے اس ادارے کی نگراں اور منتظمہ مس مارجری فائسن سے میرا تعارف کرایا۔ مس فائسن کی مسز خورشید سے بہت پرانی جان پہچان تھی۔ تعارف میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ مس صاحبہ مسٹر فائسن (آئی۔سی۔ایس) کی صاحبزادی ہیں۔ جو ۲۵-۱۹۲۴ء میں ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہ چکے ہیں اور پنجاب میں خاصی شہرت رکھتے تھے اور میری اُن سے صاحب سلامت بھی تھی۔

ہم اسکول کے اندر پہنچے اور وہاں داخل ہوتے ہی ان آنکھوں نے یہ دیکھا کہ بچوں کی رہائش جس حصے میں تھی، اُس پر بڑی کس مپرسی برس رہی تھی۔ خود مس فائسن اسی بوسیدہ عمارت میں رہتی تھیں، جو کمرہ اُن کی رہائش کے لیے مخصوص تھا، وہ مچھروں اور مکھیوں کی جولاں گاہ نظر آتا تھا۔ میں سخت حیران تھا کہ ایک انگریز خاتون، جس کی پرورش خوشحال گھرانے میں ہوئی ہے اور ہر قسم کے اسباب راحت جسے میسّر آئے ہیں وہ اس ماحول میں کس اطمینان اور خوشی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے۔

مجھے اُس دن اس کا احساس ہوا کہ غریبوں، پریشاں حالوں،

ضرورت مندوں اور محتاجوں کی ہمدردی اور خدمت کا جذبہ اپنے اندر کس قدر اطمینان و مسرّت رکھتا ہے کہ جس کی خاطر آدمی اپنے عیش اور آرام کو تج دیتا ہے ـــــ آنکھیں دُنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں جو کوئی اس نعمت سے محرُوم ہو، اُس کا غم آنکھوں والے کس طرح محسُوس کر سکتے ہیں !

مس فائسن کے ایثارِ نفس کا مجھ پر بڑا اثر ہُوا کہ اُنھوں نے اپنی زندگی اِن معصُوم نابینا بچّوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہے۔ اُس دِن کے بعد میں وقتاً فوقتاً وہاں جاتا رہا اور میں نے ہر بار نمایاں طور پر یہ بات دیکھی کہ بچّوں کے لباس، تعلیم اور خوراک میں پہلے سے کچھ ترقی ہو گئی ہے۔

مِس فائسن ان بچّوں کی تعلیم و نگہداشت کے ساتھ ان کی نفسیات اور طبائع و خصائل کا بھی بڑے غور و فکر سے مشاہدہ کرتی رہتیں، ایک دِن اُنھوں نے مجھ سے کہا ـــــ یہ بچّے بڑی شِدّت سے محسُوس کرتے ہیں کہ وہ معاشرے سے الگ کوئی دُوسری مخلُوق ہیں۔ پھر وُہ کہنے لگیں؛ یہاں کے متموّل باشندوں کو چاہیے کہ وہ گاہ بگاہ اپنے گھروں پر ان بچّوں کو مدعو کیا کریں یا ملنے ملانے اور بات چیت کرنے کے لیے بُلا لیا کریں تاکہ ان کا احساسِ کمتری دُور ہو۔

مس فائسن کی یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی ۔میں نے دِن

اور وقت مقرّر کیا اور مس موصُوفہ سے کہا کہ آپ خُود بچّوں کو لے کر میرے غریب خانے پر تشریف لائیں ۔ چُنانچہ وہ ایک دِن سہ پہر کو بچّوں سمیت میرے یہاں پہنچ گئیں ۔۔۔ کوٹھی کے لان میں بچّوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا ۔ ڈیڑھ دو گھنٹے یہ معصُوم نونہال بڑی آزادی اور بے تکلّفی کے ساتھ کھیلتے رہے ۔ پھر ایک چھوٹا سا "مکالمہ" جو ڈرامے کے انداز میں اُنھوں نے تیّار کیا تھا، مجھے سُنایا ـــــــ میں اس عرصے میں اُن کے چہروں کو، حرکات وسکنات کو، کھیلنے کُودنے اور ہنسنے ہنسانے کو بغور دیکھتا رہا، مجھے ایسا محسُوس ہُوا جیسے میں فطرت کے اوراق کا مطالعہ کر رہا ہُوں ۔ بچّے اس ماحول میں کتنے خوش اور ہشّاش بشّاش تھے ـــــــ اُن کی مسرّت وشادمانی کو دیکھ کر میرے دل پر جو کیفیت طاری ہُوئی ، اُس کا نہ تو میں کوئی نام رکھ سکا اور نہ اُس کا اظہار میرے بس کی بات ہے ۔

اِس کے بعد کھانے کا وقت آیا، تو اُن بچّوں کو کھانے کی میز پر لایا گیا، مِسز خورشید اور مس فائسن اُن کی دیکھ بھال کے لیے ٹیبل کے پاس کھڑی رہیں ۔ مَیں بھی وہاں موجُود رہا اور اُن کے کھانے کے طور وطریق کو دیکھتا رہا، میں نے اُنھیں دیکھ کر محسُوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حِکمت ومشیّت کے تحت جس کی حد ونہایت کا احاطہ کرنے سے ہماری عقل وفہم قاصر ہے ۔ ان کو بصارت سے محرُوم کر کے اُن کی

قوتِ لامسہ کو غیر معمولی تیز کر دیا ہے۔ کسی کسی بچّے کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُس کی اُنگلیوں میں آنکھیں لگی ہُوئی ہیں۔ جب وہ کھانا کھا کر رُخصت ہو گئے، تو بیگم خورشید نے بالکل وُہی بات کہی، جو خود میرے دل میں تھی، یہ کہ ــــــ

"وحید! تُم نے دیکھا ہو گا کہ بینائی نہ ہونے کے باوجُود اِن بچّوں کے (Table Manners) آدابِ طعام کتنے سُلجھے ہُوئے ہیں۔ ایسی شائستگی بینا لوگوں میں بھی کم ہی پائی جاتی ہے۔"

نابینا بچّوں کے اِس اِدارے نے گزشتہ چند سالوں میں کافی ترقّی کی ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ آداب و اَخلاق کی تربیت، دستکاری اور موسیقی سکھانے کے اِنتظامات بھی وہاں موجُود ہیں۔ یہ یقیناً مِس فائسن جیسی دردمند اور مُخلص خاتُون کی محنت کا ثمرہ ہے! اِس مرکز میں مُسلمان بچّوں کو مُسلمانوں کے طرز پر اور عیسائی بچّوں کو عیسائی طریق پر تعلیم دی جاتی ہے۔

سماجی بہبُود (سوشل ویلفیر) کے مسئلے کی اہمیّت بیان کرتے ہُوئے مِس فائسن نے مُجھ سے کہا کہ مجھے سب سے زیادہ تکلیف اور شکایت اِس بات کی ہے کہ غریب والدین عام طور پر اپنے نابینا بچّوں کو جُدا کرنے کے لیے تیّار نہیں ہوتے، کیونکہ وہ بچّے اُن کی کمائی کا

ذریعہ ہوتے ہیں۔ بڑی بے رحمی اور بے غیرتی کے ساتھ اُن سے بھیک مانگنے کا کام لیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سوسائٹی میں بھکاریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مس فائسن ایک معزّز اور خوشحال گھرانے کی خاتون ہیں۔ اُنھوں نے شادی نہیں کی۔ یہی نابینا بچّے اُن کی اولاد اور مقصدِ زندگی ہیں، جن پر اُن کی تمام توجّہ اور مامتا صَرف ہوتی ہے۔ اخلاص و جانفشانی کے سبب اُن کے کام میں اللہ تعالیٰ نے خیر و برکت عطا کی ہے اور یہ ادارہ ایک فرد کی پُرخلوص کوشش کی بدولت ترقّی کرتا چلا جارہا ہے۔

ڈاکٹر ہالینڈ

خیر پور میرس کے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک بُوڑھا انگریز ایک معذور عورت کو پہیئوں والی کُرسی پر بٹھا کر لاتا اور لے جاتا ہے۔ مجھے تجسّس ہُوا کہ آخر یہ کون شخص ہے اور اس عورت سے اسے کیا دلچسپی ہے ــــ؟ دریافت کرنے پر معلُوم ہُوا کہ یہ مشہُور ڈاکٹر ہنری ہالینڈ کے فرزند ڈاکٹر رونی ہالینڈ ہیں۔ امراضِ چشم کے ماہر معالج! ــــ عمر ۵۵ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اُنھوں نے شادی کی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد اُن کے یہاں لڑکی پیدا ہُوئی اور اس کے کُچھ عرصے بعد اُن کی بیوی کو ایسی تکلیف لاحق ہُوئی کہ یہ نیک خاتُون چلنے پھرنے سے بالکل معذُور ہو گئی۔ اس خاتون کی معذوری کا یہ حال ہے کہ بستر پر سہارا دیے بغیر کروٹ تک تبدیل نہیں کر سکتی! اسی لیے یہ میاں بیوی جہاں جاتے ہیں، خاص طور سے ڈبل بیڈ کا انتظام ہوتا ہے تاکہ ڈاکٹر موصُوف اپنی معذُور اہلیہ کے قریب رہیں اور رات کو جب بھی ضرُورت ہو اُنھیں سہارا دے کر کروٹ تبدیل کراتے رہیں۔

میں یہ واقعہ سُن کر گہرے سوچ میں پڑ گیا کہ ایثارِ نفس اور

اِنسانی ہمدردی کی یہ کس قدر انوکھی مثال ہے کہ ایک خاوند سالہا سال ایک معذور اور اپاہج بیوی کی اِس پابندی کے ساتھ خدمت کرتا رہے۔ عام طور پر تو مفلوج بیویوں کے خاوند یا عزیز کنارہ کش ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور اپاہج بیویوں کو ناگوار بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ میں نے اِن میاں بیوی کے متعلق مزید معلومات بھی حاصل کیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ـــــ

جب سے ڈاکٹر ہالینڈ کی بیوی معذور ہوئی ہے، اُنھوں نے اپنی پوری زندگی خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی ہے اور یہ اپاہج بیوی اِس نیک کام میں اُن کی معاون و مددگار ہے۔

ڈاکٹر موصوف آئی اسپیشلسٹ ہیں اور آنکھوں کا آپریشن نہایت کامیابی سے کرتے ہیں۔ کوئٹہ میں اُن کا ہیڈ کوارٹر ہے، مگر دُوسرے مقامات کا دَورہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ خیرپور، شکارپور اور دُوسرے مضافات میں وقتاً فوقتاً کیمپ لگاتے ہیں اور ڈاکٹروں کو ٹریننگ بھی دیتے ہیں۔

دُنیا میں عام طور پر لوگ اپنی ہی ذات اور فائدے کے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنے آرام و آسائش اور عزّت و دولت کے لیے ہمہ وقت جدّ و جہد کرتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ہالینڈ اُن لوگوں

میں نظر آئے جو خود بے آرام رہ کر اور تکلیف اُٹھا کر دُوسروں کے
کام آتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ مقصد کسی ذاتی منفعت یا تجارتی
مفاد کے طور پر نہیں اپنایا۔ جس کسی کو اِستطاعت ہوتی ہے، اُس
سے برائے نام فیس قبوُل کر لیتے ہیں اور جو بالکل غریب ہوں، اُن
کا مُفت علاج کرتے ہیں۔ آنکھیں جسم کا سب سے قیمتی جُزو ہیں
لیکن ان کی بیماریاں زیادہ تر غریبوں کو ہی لاحق ہوتی ہیں، اِس لیے
کہ وہ افلاس کی وجہ سے پُوری اِحتیاط نہیں برت سکتے ــــ
دیہات کے مریض، ڈاکٹر ہالینڈ کے آنے اور کیمپ لگانے کی خبر
سُن کر بڑی تعداد میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہر مریض سے خوش خلقی کا
برتاؤ اور اُس سے پُرخلوص ہمدردی اُن کا ایسا معمُول ہے، جو ہر
طبیب اور ڈاکٹر کا لازمی شِعار ہونا چاہیے۔ گزشتہ سال کے
صرف ایک کیمپ میں اُنھوں نے خیرپور کے تین سو مریضوں کا
آپریشن اور بارہ سو مریضوں کی آنکھوں کا علاج کیا۔ اِن اعداد و شمار
سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کی اِس خاموش خدمت اور
پُرخلوص کوشش کا دائرۂ عمل کتنا وسیع ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہالینڈ جس وقت آنکھوں کا
آپریشن کرتے ہیں، اُن کی مفلوج بیوی پہیّوں والی گاڑی میں بیٹھ کر
ان کے قریب رہتی ہیں اور آپریشن میں مدد دیتی ہیں ــــ مریضوں

کی دیکھ بھال، شفاخانے کا اِنتظام اور حساب کتاب ـــــ پہیئوں والی کُرسی پر بیٹھ کر اِن سب فرائض کو وہ انجام دیتی ہیں۔
قدرت نے اِس خاتُون میں اِنتظام کا جوہر ودِیعت کیا ہے۔ میاں بیوی میں کیسی مُحبّت ہے! تعلقات کس قدر خوشگوار ہیں کہ ایک لمحے کے لیے بھی ایک دُوسرے کی جُدائی اور دُوری گوارا نہیں ـــــ خدمتِ خلق زندگی کا نصبُ العین! ـــــ گویا اخلاص و محبّت اور اِنسانی ہمدردی کے زندہ مجسّمے ہیں ـــــ ایسے لوگوں کو دیکھ کر ہی اِنسانیت کی قدروں کا اندازہ ہوتا ہے اور انھیں لوگوں سے دُنیا میں دُوسروں کے لیے ہمدردی اور قُربانی کا جذبہ زندہ ہے!

شیخ اعجاز احمد

شیخ صاحب، شاعرِ مشرق علّامہ اقبالؒ کے بھتیجے ہیں۔ اُن کا مفصّل تذکرہ "روزگارِ فقیر"، جلد اوّل اور دوم میں آ چکا ہے۔ شیخ صاحب کی عُمر اس وقت ستّر سال کے قریب ہے۔

شیخ اعجاز احمد کے والد شیخ عطا محمدؐ صاحب کے ساتھ اپنے والدِ مرحوم فقیر سیّد نجم الدّین کے تعلّقات کا ذکر "روزگارِ فقیر" جلد اوّل میں تفصیل کے ساتھ کر چکا ہوں۔ اُس زمانے کے بزرگ اپنے دوست کی اولاد کو بھی دوست سمجھتے تھے۔ چنانچہ شیخ عطا محمدؐ صاحب کے بعد شیخ اعجاز احمد سے بھی میرے والد کے تعلّقات آخر عمر تک استوار رہے۔ اسی تعلّق کی بنا پر میں شیخ صاحب کو ہمیشہ "چچا" کہتا ہوں۔

آج کل عام زندگیوں میں جو دلچسپیاں اور رنگینیاں پائی جاتی ہیں، اُن کے پیشِ نظر میں شیخ صاحب کی زندگی کو سادہ اور خشک

کہہ سکتا ہوں ۔ اُن کی دوستی اور ملاقاتوں کا دائرہ محدود ہے ۔ مگر جن چند گنے چُنے لوگوں سے اُن کے مراسم ہیں، وُہ سراسر اِخلاص اور مودّت پر مبنی ہیں ۔ اُن میں کسی قسم کے تکلّف، نمائش، تصنّع اور دُنیا دِکھاوے کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا ۔ سال ہا سال کے تعلّقات ہیں، مگر ہموار اور معمُول کے مطابق ۔ کسی دوست کا کوئی گِلہ نہ شکوہ، نہ شکر رنجی اور کبیدہ خاطری ۔ صاف دل، صاف ذہن ۔ جو کچھ محسُوس کیا اُسے کسی جھجک کے بغیر ظاہر بھی کر دیا ۔ اِس قسم کے کردار سے کسی دوست کو شکایت کہاں پیدا ہو سکتی ہے ۔

شیخ صاحب بالطّبع سنجیدہ اور خاموش واقع ہُوئے ہیں ۔ غیر ضرُوری باتوں میں بحث مباحثہ کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرتے ۔ گفتگو کے دوران وُہ کسی شدید سے شدید اِختلافِ رائے کے موقع پر بھی اصُولِ اَخلاق اور شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتے ۔ میں اُنھیں صدق دل سے اپنا بزرگ سمجھتا ہُوں اور کسی مُعاملے میں مشوَرے کی ضرُورت ہوتی ہے تو اُن سے رجُوع کرتا ہُوں ۔ وُہ بڑی سنجیدگی اور ضبط و تحمّل کے ساتھ مُعاملے کی تفصیل سُنتے ہیں اور جچے تُلے الفاظ میں اپنی رائے کا اِظہار کر دیتے ہیں ۔ عرصۂ دراز سے دیکھ رہا ہُوں، بلکہ یُوں کہیے، مُسلسل تجربہ کر رہا ہُوں کہ زِندگی اور اُس کے تعلّقات و روابط

کے بارے میں اُن کے جو اصُول پہلے تھے، وُہی آج بھی ہیں۔ معمُولاتِ زندگی پر اس قدر سختی کے ساتھ قائم رہنے کی مثال اِس زمانے میں خال خال ہی کہیں مِل سکتی ہے۔ خوراک، لباس، رہن سہن، دفتری مشاغل، مطالعہ اور دُوسرے اوقات اور امور میں شہرت اور نمائش سے گریز۔ حالات کی کوئی اُفتاد، وقت کا کوئی تغیّر اور دُنیوی مفاد کی کوئی مصلحت، اُن کے کسی معمُولِ زندگی کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اُن کی زندگی کا پُوری طرح جائزہ لینے کے بعد مَیں اِس نتیجے پر پہنچا ہُوں کہ شاید "معقُول" کا لفظ انھی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

علّامہ اقبالؒ کی زندگی اور شاعری پر اُن کے پاس جو قیمتی مواد وافر مِقدار میں موجُود تھا، مجھے اُس کا عِلم اور اندازہ تھا۔ اِس لیے مَیں جب بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، اُن سے عرض کرتا کہ علّامہ کے بارے میں جو واقعات آپ کے عِلم اور ریکارڈ میں ہیں، اُنھیں قلمبند کرا دیجیے ورنہ یہ سرمایہ گمنامی کی نذر ہو کر رہ جائے گا۔ وہ میرے اصرار پر ہمیشہ یہی جواب دیتے ـــــ

"ہاں! جیسے ہی فُرصت مِلی، ضرُور لکھُوں گا۔"

کم و بیش تیرہ سال تک وہ میرے اس سوال کا یہی جواب دیتے رہے۔ جب "روزگارِ فقیر" کی پہلی جلد شائع ہو چُکی، جس میں اُن کا

دیا ہُوا بہت کچھ قیمتی مواد اور مفید مشورہ شامل تھا تو اُنھوں نے بڑی محبّت کے ساتھ فرمایا ــــــ

”بھائی وحید! میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا ہے کہ تُم سے بہتر اِس کام کو میں نہیں کر سکتا۔ اِس لیے میرے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر ہے۔“

مَیں نے انھیں یقین دلایا کہ مَیں انشاء اللہ اُن کے دِیے ہُوئے مواد کو اپنی استطاعت اور امکان کی حد تک شایانِ شان طریقے پر شائع کرنے کا بندوبست کرُوں گا۔ شیخ صاحب نے ایک بار یہ فیصلہ کرنے کے بعد جس فراخ دلی اور فیّاضی کے ساتھ معلُومات کا بھرپُور خزانہ میرے حوالے کیا، اُسے مَیں مرتے دم تک کسی طرح فراموش نہیں کر سکتا۔ شیخ صاحب نے کاغذات، مخطُوطات، دستاویزات اور یادداشتوں کی صُورت میں جس قدر معلُومات جمع کر رکھّی تھیں، اُنھیں ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز سمجھا اور اس قدر احتیاط اور سلیقے بلکہ عقیدت و محبّت کے ساتھ اِس انمول سرمایے کو محفُوظ رکھّا کہ دُوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔

دو چار چیزیں ہوں تو اُن کا ذکر کیا جائے۔ علّامہ کے غیر مطبُوعہ خطُوط، تعلیمی ڈگریاں، وصیّت نامہ، جائیداد اور خاندانی وراثت سے

متعلّق اہم دستاویزات اور سب سے بڑھ کر علاّمہ کے سینکڑوں غیر معرُوف اشعار جو اُنھوں نے ایک بیاض کی صُورت میں علاّمہ کے اصل کاغذات اور یادداشتوں سے براہِ راست نقل کر کے جمع کیے تھے شاید کوئی لعل و جواہر کی بھی اِتنی حفاظت نہیں کر سکتا، جس حفاظت کا اِہتمام شیخ صاحب نے فرمایا۔

"روزگارِ فقیر" کی دُوسری جلد زیرِ ترتیب تھی تو اُس وقت ایسا موقع آیا کہ راقم الحرُوف کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسُو آ گئے۔ اُنھوں نے علاّمہ کے یہ آٹھ سو اشعار اپنی بیاض سے نقل کر کے مجھے مرحمت فرمائے، جو اِس سے قبل شاعرِ مشرق کے کسی مجمُوعۂ کلام میں شائع نہیں ہُوئے ہیں۔ اِس موقع پر مَیں نے اُن سے کہا ــــ

"چچا! یہ تو خزانہ ہے۔ بیش بہا خزانہ۔
اِسے اپنی اولاد کے لیے رہنے دیجیے۔ آج سے چالیس پچاس سال بعد اِس خزانے کی صحیح قدر و قیمت کا لوگوں کو اِحساس ہو گا اور اُس وقت علاّمہ کے ان اشعار کی قیمت لاکھوں روپے ہو گی"۔

شیخ صاحب نے مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا، جن کو معنی خیز تو نہیں البتّہ "عجیب" کہا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے فرمایا ــــ

"کیا تُم چاہتے ہو کہ میں اپنے چچا (علاّمہ اقبال)

کا نام فروخت کروں"؟

اِس کے بعد شفقت آمیز لہجے میں کہا ــــ

"اِنھیں تم ہی شائع کرو!"

یہ شاعری اور افسانہ نگاری نہیں، واقعی حقیقت ہے کہ شیخ صاحب چاہتے تو علّامہ کے متعلق اِتنے وسیع ذخیرۂ معلومات کو ذریعۂ منفعت بنا سکتے تھے اور یہ خود اُن کی ذاتی شہرت اور شخصی ترفُّع کا وسیلہ بھی بن سکتا تھا۔ مگر اُن کی شانِ توکّل اور اصُولِ زندگی نے اسے گوارا نہ کیا۔ نام ونمُود اور غرض ومنفعت کی اِس دنیا میں اِس ایثار و اِخلاص کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔
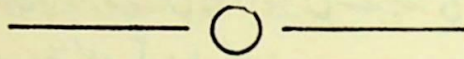
ضیاءُ الدّین احمدؒ زبیری

۱۹۴۷ء میں جب مملکتِ خداداد پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو مجھے حکومت کی طرف سے سرکاری ملازمین اور عملے کو پاکستان پہنچانے پر متعین کیا گیا۔ بمبئی میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ضیاءُ الدّین احمدؒ صاحب زبیری سے میری پہلی مُلاقات وہیں پر ہوئی اور اس پہلی مُلاقات ہی میں اُن کی شخصیت نے میرے ذہن و فکر پر نقش چھوڑا۔ اِس کے بعد کئی سال تک اُن کو دیکھنے اور مِلنے کا موقع نہ مل سکا۔

اِس متمدّن دُنیا میں کوئی چاہے کتنا ہی دُنیوی مشاغل سے دُور رہنا چاہے، مگر وہ بنکوں اور سرکاری دفتروں سے بالکل غیر متعلق اور جوگی اور راہب بن کر نہیں رہ سکتا۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ اِن اداروں سے ہر کسی کا کوئی نہ کوئی کام ضرور متعلق رہتا ہے۔ راقم الحروف کو بھی انکم ٹیکس کے سلسلے میں کراچی میں زبیری صاحب کے دفتر میں جانے کا اتّفاق ہُوا۔

وہ اِس محکمے کے بہت بڑے افسر ہیں۔ مگر میرے لیے وجہِ کشش اُن کا عہدہ نہیں، بلکہ اُن کی ذہانت اور اُن کا خلوص تھا، جس نے مجھے گرویدہ کر لیا۔ اور اُن کی یہی فطری خوبیاں ہمارے برادرانہ مراسم اور دوستی کا سبب بن گئیں۔

دُوسرے موضُوعات کے علاوہ میں اپنی تصانیف کے سلسلے میں بھی وقتاً فوقتاً اُن سے تبادلۂ خیال کرتا رہا ہوں۔ وہ انگریزی میں کمال درجے کی مہارت بلکہ بصیرت رکھتے ہیں۔ اُن کی رائے عام طور پر بڑی جچی تُلی اور اُن کا مشوَرہ بڑا صائب ہے۔ ہر بات کا جواب ذمّہ داری کے پُورے احساس کے ساتھ دیتے ہیں۔ اُن کی زندگی سِیدھی سادی اور اُن کے روابط و تعلقات بے لوث ہیں۔ مِلنے مِلانے میں وہ بڑے مُحتاط ہیں۔ احباب کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں ہے، لیکن جن سے اُن کی دوستی ہے وہ دلی تعلق پر مبنی ہے۔ ذاتی تعلّقات اور دوستی میں وہ غرض اور طمع کے ذرّہ بھر روادار نہیں ہیں۔

اِنصاف اُن کا مسلک اور دیانت و صداقت اُن کی طینت ہے اِس سلسلے میں بہت سے واقعات خُود میرے تجربے اور مشاہدے میں آچکے ہیں۔ یہاں صرف ایک واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہُوں۔ سُنیے۔

میرے ایک دیرینہ رفیقِ ملازمت مسٹر سی۔ سی ڈیسائی (آئی۔ سی ایس) بھارت گورنمنٹ کی طرف سے ہائی کمشنر ہو کر کراچی آئے۔ پرانے

تعلقات کی بناء پر وُہ گاہ بگاہ مجُھے آم، پان اور کیلے تحفتہً بھیجتے رہتے۔ اُن کو اِس کا علم تھا کہ یہ چیزیں مجھے بہت مرغُوب ہیں۔

ایک روز اُنھوں نے دس درجن کیلے میرے یہاں بھیجے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ ان کو میرے مُختلف دوستوں میں تقسیم کردو اور کچُھ کیلے زبیری صاحب کے یہاں بھی جاکر دے آؤ۔ ڈرائیور کیلے لے کر صاحبِ موصُوف کے یہاں پہنچا اور وہاں سے واپس آکر بولا کہ زُبیری صاحب نے بہُت بہُت سلام کہا ہے اور ساتھ ہی تاکِید کی ہے کہ اپنے صاحب سے کہہ دینا کہ وُہ کل مجُھ سے ضرُور مِل لیں ـــــ ڈرائیور کی زبانی یہ پیغام سُن کر مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ زبیری صاحب نے نہ جانے کس کام کے لیے مجُھے بُلایا ہے، کیونکہ اُنھوں نے اِس سے پہلے اِس تاکید اور اصرار کے ساتھ کبھی نہیں بُلایا تھا۔

میں دُوسرے دِن شام کے وقت زبیری صاحب کی قیام گاہ پر پہنچا تو علیک سلیک اور مزاج پُرسی کے بعد اُنھوں نے فورًا ہی ناخوشی کے لہجے میں مجُھ سے کہا۔

"میاں! میں تو تم کو اپنا بھائی سمجھتا ہُوں۔
جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے تمُھارے ساتھ
کوئی بُرائی بھی نہیں کی۔

ـــــ پھر تُم ـــــ

میری اولاد کے ساتھ دُشمنی کیوں کر رہے ہو؟"

اُن کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ دِل ہی دل میں کہنے لگا۔ میں اور زبیری جیسے مُخلص دوست کی اولاد کے ساتھ دُشمنی —— یہ مَیں آخر کیا سُن رہا ہُوں —— مَیں نے پریشان ہو کر اُن سے دریافت کیا ——

"خُدارا صاف لفظوں میں بتائیے۔ مُجھ سے ایسی کون سی حرکت سرزد ہُوئی ہے، جو آپ نے اِتنا سنگین الزام مجھ پر لگا دیا اور ——"

میری گھبراہٹ دیکھ کر وُہ جلدی سے بول پڑے۔ "سُنیے ——

اللہ تعالیٰ کے فضل سے میرے گھر میں دس بچّے ہیں۔ میں اُن کی ذہنی تربیّت اِس انداز سے کر رہا ہُوں کہ دیانت اُن کی فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ جن کو تم بچّے سمجھ رہے ہو، وہ گھر کے حالات سے انجان اور بے خبر نہیں ہیں۔ وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ اُن کے باپ کی تنخواہ اِتنی نہیں ہے کہ پُورے گھر کو پھل خرید کر کھلا سکیں۔ اِس گرانی کے زمانے میں آدمی جائز آمدنی پر اِکتفا کرے تو نان و نمک مشکل سے چلتا ہے۔ آج جو کیلے تُم نے بھیجے ہیں، وُہ اُنھوں نے شوق سے کھا لیے۔ کل یہ شوق اُبھرے گا اور بڑھے گا تو یہ آخر میرے بچّے اور جگر کے ٹکڑے ہیں مجھے ان کا شوق پُورا کرنے اور اُن کی دلدہی کے لیے دوستوں سے کیلوں کی فرمائش کرنا پڑے گی اور اُن کا ممنُونِ احسان ہونا پڑے گا۔

اِس طرح بچّوں کے ذہن پر یہ اثر مرتّب ہوگا کہ ہمارے والد نے تنخواہ کے علاوہ ہدیوں اور تحفوں کے کچھ بالائی ذرائع پیدا کر لیے ہیں۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میں نے بد دیانتی سے نفرت کا جو جذبہ اُن کے دل میں پیدا کیا ہے، وہ رفتہ رفتہ کمزور ہو کر فنا ہو جائے گا اور میری نسل آئندہ چل کر حرام و حلال میں امتیاز نہ کر سکے گی۔

زُبیری صاحب بول رہے تھے اور میں ندامت کے مارے پانی پانی ہُوا جارہا تھا۔ مَیں نے اُن سے مُعافی مانگی اور اُن کے یہاں سے یہ تصوّر لے کر واپس ہُوا کہ اِس مفاد پرست دُنیا میں اِس کردار کے عہدیدار بھی پائے جاتے ہیں۔ انکم ٹیکس کا محکمہ اور پھر "ڈائرکٹر آف انسپکشن انکم ٹیکسز" کا بلند و بالا عُہدہ۔ وہ اپنے اصُولوں پر اِس قدر سختی سے قائم نہ رہتے تو ذرا سی چشم پوشی اور ڈِھیل اُن کو خوش حال اور دولت مند بنا دیتی۔ مگر اُن کے خیال میں اِنسان کی اصل دولت روپیہ پیسہ نہیں، دیانت و صداقت اور خودداری ہے۔

افسوس ہے، یہ حقیقت بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے، مگر جس کی سمجھ میں آجاتی ہے تو وہ اقبالؒ کا "مردِ قلندر" بن جاتا ہے۔
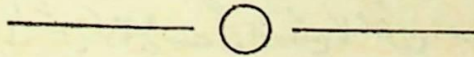
انور علیؒ

ہند و پاک کی وزارتِ مالیات میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمدؒ مرحوم کے پرائیویٹ سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ آج کل حکومتِ سعودی عرب کے مشیرِ مالیات ہیں۔ قدیم دوستانہ مراسم کی بناء پر میں نے اُنھیں چند ماہ قبل خط لکھا کہ میں اپنی کتاب "محسنِ اعظم اور محسنینؓ" کے عربی ترجمے میں مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ کی تازہ ترین تصاویر شائع کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ کرم یہ تصاویر آپ مہیّا کر کے بھجوا دیں۔ اُن کا کوئی جواب نہ آیا تو مجھے اِس پر بڑی حیرت ہوئی کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ صاحبِ موصوف اپنے معاملات میں باقاعدگی اور ضبط و نظم کی جزئیات تک کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک روز مجھے کسی صاحب نے خبر دی کہ وہ چند روز کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں اور گورنر اسٹیٹ بنک سیّد شجاعت علی حسنی صاحب کے مہمان ہیں۔ میں نے وہاں ٹیلی فون کیا۔ جواب ملا؛ باہر

گئے ہُوئے ہیں۔ مَیں نے کہا کہ جب بھی آئیں، میرا نام اُنھیں بتا دِیا جائے۔

شام کو معمُول کے مُطابق مَیں کوٹھی کے باغیچے میں بیٹھا تھا کہ اِتنے میں ایک کار لان کے قرِیب آکر رُکی اور انور علی صاحب مُسکراتے ہُوئے اُس سے اُترے۔ مَیں نے کہا: آپ نے کیوں زحمت کی، مَیں خُود حاضر ہو جاتا۔ جواب میں بولے: نہیں، یہ تو میرا فرض تھا۔ میرے آنے سے پہلے آپ تشریف لے آتے تو مَیں اِس فرض میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا۔ آپ نے میرے ذِمّے جو کام کِیا ہے، وُہ مجھے اچھّی طرح یاد ہے۔ میں آج ہی واپس جا رہا ہوں۔ سعُودی عرب پہنچتے ہی مطلُوبہ تصویریں آپ کو بھیج دُوں گا۔ (چنانچہ اُنھوں نے وعدہ پُورا کیا اور تصوِیریں بھیج کر مجھے ممنُونِ احسان فرمایا۔)

اُن کا یہ طرزِ عمل اِس کی شہادت دیتا ہے کہ وُہ دوستی کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں اور دوستوں کے درمیان جو یقین و اعتماد کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، اُس کی اہمیّت سے وُہ باخبر ہیں۔

انوَر علی کُچھ دیر بیٹھے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اِس قِسم کی باتوں کو دُہراؤں تو یہ کتاب ایک دفتر بن جائے۔ پھر ہر بات بیان بھی تو نہیں کی جاتی۔ ہاں! چلتے ہُوئے جو بات وُہ کہہ گئے، اُس کا ذکر اِس لِیے ضرُوری ہے کہ مَیں نے نہ جانے کِتنی بار اُس کا لُطف اُٹھایا ہے اور قارئین کو بھی اِس لطف میں شریک کرنا چاہتا ہُوں۔ اُنھوں نے فرمایا ——

"اللہ تعالیٰ نے محبّت اِنسان کی فِطرت میں وَدِیعت

کی ہے، لیکن اس کا سب سے گھٹیا درجہ یہ ہے کہ اِنسان
صِرف اپنی ذات سے مُحبّت کرے۔ جَیسے جَیسے اس مُحبّت
کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے، اِنسان کا مقام بھی بلند ہوتا
جاتا ہے۔ حتّٰی کہ اُس کا اِنتہائی مقام پیغمبری ہے۔ یہ ایسی
فرازاور بلند ترین سطح ہے، جہاں انسان کائنات کی
ہر شے سے مُحبّت کرنے لگتا ہے"۔

یہ چند فقرے جو انور علی صاحِب روا روی میں کہہ گئے۔ غور و فِکر
کے لیے ایک قیمتی نکتہ ثابت ہُوئے۔ میرے خیالات پر اِس کا
بہُت گہرا اثر ہُوا اور مُجھ پر سوچنے کی نئی راہیں کھُل گئیں۔ واقعہ بھی
یہ ہے کہ جب سے اِنسان نے اپنی مُحبّت کا دائرہ ذاتی مَسرّت اور
راحت و آسائش تک محدُود کیا ہے، اِنسان ذِہنی سکُون اور رُوحانی
اِطمینان سے محرُوم ہو گیا ہے۔ خود غرضی اور نفسا نفسی کی بدولت زندگی
کے ہر شُعبے میں اِضطراب اور اِنتشار کے آثار پائے جاتے ہیں۔

سب لوگ انفرادی طور پر اپنے اپنے متعلق جتنا سوچتے ہیں، اگر
مِل کر ساری اِنسانیت کی بھلائی کے لیے سوچیں تو یہ دُنیا واقعی جنّتِ آدم بن
سکتی ہے۔ صِرف اپنی ذات سے مُحبّت کرنا اور اپنے متعلق سوچنا بلاشبہ مُحبّت کا
اِنتہائی تنگ دائرہ ہے حالانکہ فطری طور پر اِنسان کو اِس قدر تنگ نظر اور خود غرض
پَیدا نہیں کیا گیا۔

مولٰینا قمرالحسن تھانوی

میرا آبائی وطن لاہور ہے، مگر کاروباری اِنتظامات کے لیے کراچی میں سکونت اِختیار کرنا پڑی۔ میرے عزیز دوست مجیب احمد انصاری مرحوم نے، جو بمبئی میں میرے رفیقِ مُلازمت رہ چُکے تھے، ایک روز ٹیلی فون پر مجھ سے کہا کہ مولٰینا قمرالحسن تھانوی کو آپ کے پاس بھیج رہا ہُوں ——اُن دِنوں مولٰینا موصُوف کی نگرانی میں کراچی میں ایک مسجد اور بچّوں کی دینی تعلیم کے لیے مکتب زیرِ تعمیر تھا۔ اس کے چندے کی فراہمی کے سلسلے میں مولٰینا سے میری پہلی بار مُلاقات ہُوئی اور اُس کے بعد سے وقتاً فوقتاً اُن سے مُلاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

مولٰینا جب بھی آتے، مذہبی موضُوعات پر اُن سے تبادلۂ خیال ہوتا۔ اِن مُلاقاتوں میں غالباً اُنھیں میرے دِینی شغف اور مذہبی دلچسپی کا اندازہ ہُوا۔ ایک دِن جو وُہ تشریف لائے تو علّامہ سیّد سلیمان ندوی کی

مُرتّبہ "سیرتُ النّبیؐ" کی تیسری جلد اُن کے ہاتھ میں تھی، جسے وُہ راقم الحرُوف کے لیے خرید کر لائے تھے۔ فرمایا کہ آپ وقت نکال کر اس کتاب کو ضرُور پڑھیں۔

مَیں نے کہا کہ یہ تو تیسری جلد ہے۔

اُنھوں نے جواب دیا کہ مَیں دانستہ تیسری جلد لایا ہُوں۔ پہلی جلد کا تو آغاز ہی علمی بحث سے ہوتا ہے۔ مُطالعے سے طبیعت کہیں اُکتا نہ جائے۔ اُن دونوں کے مُقابلے میں یہ تیسری جلد آپ کے لیے زیادہ دلچسپ رہے گی۔ جب اِسے ختم کرلیں گے تو باقی جلدیں پڑھنے کا شوق بھی آپ ہی آپ پیدا ہو جائے گا اور آپ مصنّف کے طرزِ تحریر اور افکار سے مانُوس بھی ہو جائیں گے۔

اُس وقت مولٰینا کی یہ منطق میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی۔ یہ کتاب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی مقدّس سیرت پر تھی۔ اِس لیے اسے بڑے شوق وعقیدت کے ساتھ میں نے پڑھا۔ اِس کا ختم کرنا تھا کہ بقیہ جلدیں پڑھنے کا شوق پیدا ہُوا اور اس شوق نے خاصی شدّت اختیار کی۔ بالکل اسی طرح جیسے دو چار گھونٹ پانی پی کر پیاسے کی تشنگی بڑھ جاتی ہے۔ مَیں نے اس کے بعد "سیرتُ النّبیؐ" کی تمام جلدیں بازار سے منگوائیں، اور ترتیب کے ساتھ سلسلہ وار پہلی جلد سے باقاعدہ مُطالعہ شرُوع کر دیا۔ پابندی کے ساتھ اُن کتابوں کے مُطالعے کے لیے مجُھے اپنے معمولات میں

خاصی تبدیلی کرنا پڑی ۔ مُلاقاتوں کا دائرہ محدود کر دیا ۔ ملنے کے لیے آنے جانے والوں کی تعداد بھی میرے اوقات اور رنگ کو دیکھ کر کم ہو گئی ۔ مَیں تھا، میرا کمرہ تھا، تنہائی تھی اور "سیرتُ النبیؐ" کی جلدوں کا مُطالعہ ۔ اِس انہماک اور توجّہ کے باعث کتاب کا قلب پر بہُت گہرا اثر ہُوا ۔ مغربی مصنّفین کے پیدا کیے ہُوئے بہُت سے شکُوک و شُبہات اِس طرح رفع ہُوئے، جیسے پانی کے بُلبُلے سطحِ آب پر اُبھر کر ٹُوٹ جاتے ہیں ۔ مطالعے کا یہ پُورا وقت میرے نزدیک عبادت میں گُزرا ۔ مطالعہ ختم کرنے کے بعد اس کا بھی احساس ہُوا کہ علّامہ شِبلی نعمانی نے "سیرتُ النبیؐ" لکھ کر اردُو زبان و ادب کی آبرو بڑھائی ہے اور اس کو تقدیس عطا کی ہے ۔ مولٰینا سیّد سلیمان ندوی مرحُوم بھی تحسین و ستائش اور اُمّتِ مُسلمہ کی طرف سے دُعا و تشکّر کے مُستحق ہیں کہ اپنے گرامی قدر اُستاد کے چھوڑے ہُوئے کام کو اُنھوں نے بڑے سلیقے اور کمال حُسن و خُوبی کے ساتھ پُورا کیا ۔

مَیں اِس کا اِعتراف کرتا ہُوں کہ میرے فکر و نظر اور قلب و دماغ میں دینی علم و شعور اور مذہبی احساس پیدا کرنے کا اصل محرّک اور سبب "سیرتُ النبیؐ" کا مُطالعہ تھا ۔ زاویۂ نگاہ ہی بدل گیا ۔ دل کی حالت دگرگُوں ہو گئی ۔ شوق اور شغف روز بروز بڑھتا گیا اور ذہن اِس مبارک موضُوع سے اِس قدر مانُوس ہو گیا کہ اِس گنہگار کو حضُورؐ کی سیرت پر قلم اُٹھانے کی جُرأت ہُوئی اور مَیں نے اپنی کتاب "محسنِ اعظمؐ اور محسنین" کو اپنی زندگی میں

قبولِ عام حاصل کرتے دیکھ لیا ——

مری طلب بھی اُنھیں کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اُٹھتے نہیں ہیں اُٹھائے جاتے ہیں

ایک واقعے کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ تقریباً اُنھی دِنوں امام غزالیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "کیمیائے سعادت" میرے مطالعے میں تھی۔ رات کو سونے سے پہلے اِس کتاب کو کافی دیر تک پڑھتا رہتا۔ مطالعے کے دوران جب اِس مقام پر پہنچا جہاں امامِ غزالیؒ نے ضبطِ خواہش اور تزکیۂ نفس کی اہمیت واضح کرتے ہُوئے اُن بزرگ کی مثال دی ہے کہ جن کا دل ایک دفعہ گاجر کھانے کو چاہا تو انھوں نے اِس خواہش کو دبانے کے لیے اُسی وقت سے جی میں ٹھان لی کہ گاجر نہیں کھائیں گے اور کئی برس تک گاجر نہیں کھائی۔ اِس طرح ایک اور بزرگ کا تذکرہ اِس کتاب میں نظر سے گزرا کہ اُن کا دل دُودھ میں بادام ڈال کر پینے کو چاہا تو اُنھوں نے بھی کئی سال تک اِس خواہش کو پُورا کرنے سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ اگلی صُبح مولینا ملنے کے لیے آئے تو میں نے رات کے مطالعے کا ذکر اُن سے کرتے ہُوئے کہا ——

"اِنسان کو ایسے مشکل اِمتحان میں ڈال کر مذہب کا آخر کون سا مقصد پُورا ہو سکتا ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ کئی سال تک دُودھ میں بادام ڈال کر پینے سے رُکے رہنا اور کئی سال تک گاجر نہ کھانا، یہ عمل

اِنسانی سرِشت اور اُس کی جائز خواہشات کے ساتھ
سخت گیری نہیں تو اور کیا ہے !"

مولانا نے جواب میں کہا: "آپ جن بزرگوں کے حالات اور ملفوظات پڑھ رہے ہیں، یہ وُہ حضرات ہیں جنھوں نے اَخلاق و تقوٰے اور ضبطِ نفس کا اِمتحان درجۂ اوّل میں پاس کیا ہے۔ آپ صِرف تیسرے درجے ہی میں اِس اِمتحان میں کامیاب ہو جائیے"۔ پھر اُنھوں نے اپنی بات کی مَزید وضاحت کی ــــ

"آپ اِس پر غور فرمائیں کہ لاکھوں اور کروڑوں لوگ ایسے گزرے ہیں اور اس وقت بھی ہوں گے جو روز گاجر کھاتے ہیں اور دُودھ میں بادام بھی نوش کرتے ہیں، مگر آپ نے اُن میں سے کسی کا نام بھی سُنا؟ نام وُہ قابلِ ذکر سمجھے گئے، جِنھوں نے اپنی خواہشات کے باوجُود اِن چیزوں کو سالہا سال نزدیک نہیں آنے دِیا۔ گویا تزکیۂ نفس میں خواہشاتِ انسانی دبانے اور اُن پر قابُو پانے کی اہمیت ہے، اُنھیں پُورا کرنے کی نہیں"۔

ایک دِن میرے ایک دوست نے دریافت کیا: اِس کی کیا وجہ ہے کہ انگریز من حیث القوم ہم سے زیادہ دیانت دار سمجھے جاتے ہیں۔

مولینا بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ انگریز کو من حیث القوم راستباز اور دیانت دار سمجھنا کسی طرح دُرست نہیں ہے۔ وہ صرف تجارت کے معاملے میں اصُول و دیانت سے کام لیتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وُہ اِس بات کو اچھّی طرح جانتا ہے کہ بد دیانتی سے تجارت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو وُہ گھاٹے میں رہے گا۔ لیکن جہاں تک دُوسری اقوام کے حقوق، پسماندہ علاقوں کو ہتھیا لینے اور اُن کے باشندوں کو محکوم بلکہ غلام بنانے کا تعلق ہے، انگریز بڑی سے بڑی بد دیانتی روا رکھنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اُس کی سیاسی جد وجہد خاص قسم کی ڈپلومیسی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔

اِس کے برخلاف مسلمان کو ہر حالت اور ہر مُعاملے میں، چاہے وُہ تجارت ہو یا سیاست یا زندگی کا کوئی اور شعبہ ہو، اپنے اور پرائے، مُسلم اور غیر مُسلم کے ساتھ اسلام نے دیانت برتنے کی ہدایت کی ہے۔ ہمارے ہاں سیاسی حکمتِ عملی کا مطلب یہ ہے کہ حق و انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہنے کے لیے اپنی تمام تر ذہانت، صلاحیت اور فراست کو کام میں لایا جائے۔ جھُوٹ، فریب اور عیّاری، یہ صرف انگریزی ڈپلومیسی کی خصُوصیّات ہیں۔

ایک مرتبہ یہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ مُسلمانوں کے موجُودہ اخلاقی انحطاط کو دُور کرنے کے لیے اگر اِصلاح کی جلد سے جلد کوئی تدبیر نہ

کی گئی تو یہ مرض بالکل لاعلاج اور پانی سر سے اُونچا ہو جائے گا۔ راقم الحروف نے عرض کیا کہ افراد کی ذہنی اِصلاح ہو جانے سے اِجتماعی زِندگی اور قومی کردار خُود بخُود پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ یہ مقصد ایک منظّم تحریک اور مُسلسل مُہم کا مُستحق ہے۔

مولٰینا قمر الحسن نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اِس بحث کا اصل نکتہ مریض کو صحّت بخش دوائیں دینا نہیں بلکہ مُضرِ صحّت غذا اور دواؤں کے اِستعمال سے روکنا ہے، یعنی اِصلاح کا پروگرام دراصل اِس اُصُول پر مُرتّب ہونا چاہیے کہ دورِ حاضر میں فرد اور سوسائٹی کے اَخلاق کو بگاڑنے کے لیے کروڑوں رُوپے کے مَصارِف سے جو ذرائع مُہیّا کیے گئے ہیں، اُنھیں ختم کر دِیا جائے۔ اِن مُحرّکات اور اسباب کے ختم ہوتے ہی قوم، جو بُنیادی طور پر صحت مندانہ احساسات و جذبات رکھتی ہے، خُود بخُود اَخلاقی اِعتدال پر آجائے گی۔

مولٰینا نے کہا؛ اِس قِسم کی مِثال اُس قوی الحس شخص کی سی ہے، جسے مُسلسل بے ہوشی کے اِنجکشن دِیے جا رہے ہیں، مگر وُہ اِس پر بھی اپنی بے مثال فطری قوّت کی بناء پر مکمّل طور پر بے ہوش نہیں ہو پاتا۔ بس دواؤں کا تھوڑا بہت اثر قبُول کرنے کی وجہ سے وُہ معطّل سا ہو گیا ہے۔ اِس لیے یہ کہنا بالکُل دُرست ہو گا کہ مریض تو اچھّا خاصا ہے۔ اُس کے اعضاء اور حواس کی صلاحیّت کو سلب کرنے کے لیے اَخلاقی اِنحطاط کے جو

انجکشن پے در پے دیے جا رہے ہیں، اُنھیں جلد از جلد بند کر دینا ہی اِصلاح کی سب سے اہم اور کارگر تدبیر ہے۔ راقمُ الحروف نے مولٰینا کے اِس نکتۂ دانش و اَخلاق سے اتّفاق کرتے ہُوئے یاد دلایا کہ اب سے کچھ مُدّت پہلے ہماری مائیں اور ہمارے بزرگ بچّوں کی اِبتدائی تربیت ایسے خطُوط پر کرتے تھے کہ بڑے ہو کر اُن کا اخلاقی رنگ اور دینی مزاج زمانے کے سرد و گرم اور تمدّن و تہذیب کی بُوقلمونیوں کا خراب اثر قبُول نہ کرتا تھا۔ اب یہ نقص ہمارے بچّوں کے کردار میں عہدِ طفُولیّت ہی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اب نہ وہ سیدھی اور سچّی مائیں ہیں اور نہ وُہ راسخُ العقیدہ باپ۔ سب لوگ زمانے کے نئے رنگ میں رنگ گئے ہیں اور اس طرح قوم کا آوے کا آوا بگڑ گیا ہے۔ مولٰینا نے فرمایا کہ پچھلے دَور میں مُسلمان ماؤں کی گود ہماری نسلوں کی سب سے اچھّی تربیت گاہ تھی۔ مجھے اب تک اچھّی طرح یاد ہے کہ میری والدہ رات کو سونے سے پہلے ہم بہن بھائیوں کو "نُسخۂ شفائے رُوح" سُنایا کرتی تھیں۔ اُن کی آواز میں سوز اور اُن کے لہجے میں بڑی شفقت و مَحبّت تھی۔ اس لیے اِس "نُسخے" کا ایک ایک لفظ دل پر نقش ہوتا چلا جاتا تھا۔ میرے اصرار پر مولٰینا نے وہ نظم پُوری سُنائی جسے سُن کر خُود میرے قلب نے بڑا اثر محسوس کیا۔

———○———

تأثّرات

انسان کی زندگی حوادث و واقعات کا مجموعہ ہے۔ کبھی بے لطفی، کبھی شگفتگی۔ زندگی کا ہر لمحہ اپنے ساتھ ایک نئی دُنیا لے کر آتا ہے اور مرتے دم تک یہی چکّر چلتا رہتا ہے۔ بادشاہ ہو یا فقیر، ہر کسی کی زندگی کے حالات اپنی جگہ اہمیّت رکھتے ہیں۔ بادشاہ تخت چھن جانے اور زوالِ نعمت سے جتنا متاثر ہوتا ہے۔ اس سے کم اثر وہ فقیر نہیں لیتا، جس کی جھونپڑی کا ٹمٹماتا ہُوا دِیا ہوا کے جھونکے نے ایکا ایکی بُجھا دِیا ہو۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہے ـــــ

زندگی ہے یا کوئی طُوفان ہے

زندگی میں بعض اوقات ایسے واقعات بھی پیش آتے ہیں کہ انسان اُنھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ واقعات حافظے پر کچھ اِس طرح نقش ہو جاتے ہیں کہ کسی عنوان مٹنے نہیں پاتے۔ ہاں! زمانے کی

رفتار اُنھیں دُھندلا ضرور کر دیتی ہے۔ میں ذیل میں کچھ ایسے ہی تاثّرات اور واقعات پیش کر رہا ہوں، جن میں عبرت و نصیحت کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں ـــــ

مدد

ایک صاحب مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ وُہ کِسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ علیک سلیک اور رسمی گفتگو کے بعد اُنھوں نے ایک کام کا ذکر کیا، جو اُن کے خیال کے مُطابق میرے ذرِیعے ممکن تھا اور میری کوشِش اُن کے کام آسکتی تھی۔

مَیں نے اُن سے کام کی پُوری تفصِیل پُوچھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ میری سعی و سفارش چل بھی سکتی ہے؟ اُن کی زبان سے تفصِیل سُن کر مُجھے اِس کا اندازہ ہو گیا کہ اُن کا مُعاملہ فوری توجّہ چاہتا ہے۔ اگر اِس میں تاخیر کی گئی تو اُنھیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ جب وہ اپنی بات ختم کر چکے تو میں نے اُن سے کہا ـــــ

"آپ مطمئن رہیں۔ میں، انشاءاللہ، آپ کی پُوری مدد کرُوں گا۔"

اُس شریفُ النّفس اِنسان نے، جس کا نام بھی اب مُجھے یاد نہیں ہے، اس کی قطعًا پروا نہ کرتے ہُوئے کہ وُہ صاحبِ غرض ہے

اور اسے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جو مجھے ناگوار گزرے ۔ میرے مُنہ سے یہ فقرہ ادا ہوتے ہی مجھے ٹوکا ــــــ

"دیکھیے، صاحب! مدد تو صرف خُدا کر سکتا ہے۔ آپ تو بس کوشش کر سکتے ہیں"

اس شخص کے ٹوکنے پر مجھے ایسا محسُوس ہُوا کہ کسی نے میری آنکھوں کے سامنے پڑا ہُوا پردہ اُٹھا دیا اور جیسے میں مشیّتِ ایزدی کے معاملات میں دخل درمعقولات کا مرتکب ہو رہا تھا ــــ اور جیسے کسی مُحسن اور بہی خواہ نے عتابِ الٰہی کے خطرے سے مجھے بچا لیا ۔ مَیں نے جواب میں کہا ــــــ

"بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔ انسان کی کیا مجال کہ خُدا کی مرضی کے بغیر کسی کوشش کی کامیابی یا ناکامی کا دعوٰی کر سکے"

اُس شخص کے اِس جملے نے راقم الحروف کو اِتنا متاثّر کیا کہ اپنے تمام کام چھوڑ کر اُس کے لیے پُوری کوشش کی اور اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے اُس کا کام ہو گیا۔

شرط

ایک سِندھی طالب علم میرے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ

میری آمدنی کے ذرائع محدُود کیا' قریب قریب مفقوُد ہیں۔ مَیں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے آپ سے امداد چاہتا ہُوں۔ مَیں نے اُس کا پتہ نوٹ کر لیا اور اُس سے کہا ——

"آپ اطمینان رکھیں، آپ کی یہ ضرورت ہر ماہ پُوری ہوتی رہے گی۔"

میں یہ کہہ کر اخبار پڑھنے میں مصرُوف ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد میری نظر سامنے کی کُرسی پر پڑی تو اُس نوجوان کو بدستُور بیٹھا ہُوا پایا میں نے سمجھا کہ شاید میرے اس جملے سے اُس کی تسلّی اور اطمینان نہیں ہُوا اس لیے میں نے اپنے الفاظ پر زیادہ زور دیتے ہُوئے دوبارہ کہا ——

"آپ ہر طرح مطمئن رہیں۔ جو وعدہ میں نے کیا ہے، وہ ضرُور پُورا ہوتا رہے گا۔"

نوجوان نے میری بات سُن کر جواب دیا ——

"مجھے آپ کے وعدے کے بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہُوں کہ آپ جو میری مدد فرما رہے ہیں، اُس کی شرائط کیا ہوں گی ؟ چونکہ —— معاف کیجیے —— خیرات لینا مجھے کسی طرح بھی پسند نہیں ہے ——"

مَیں اُس نوجوان کے جذبۂ حمیّت اور احساسِ خوُدداری سے

نہ صرف متاثّر بلکہ خوش ہوا۔ میرا دل باغ باغ ہوگیا اور میرے ضمیر نے پیش گوئی کی کہ اس کے اندر غیرت اور عزتِ نفس کا جو جوہر موجود ہے وہ اسے کسی بلند مقام پر پہنچا کر رہے گا۔ اُس کے اصرار پر مجھے کہنا پڑا۔۔۔

"برخوردار! اگر تم کسی شرط کے لیے ہی مُصِر ہو تو وُہ صِرف یہ ہے کہ جب کبھی تم اِس قابل ہو جاؤ کہ کسی کے کام آسکو، تو اِس سے دریغ نہ کرنا اور اپنا یہ وقت یاد رکھتے ہُوئے دُوسروں کی مدد کرتے رہنا۔ بس یہی میری شرط ہے۔ جاؤ، اللہ تعالیٰ تمھاری مدد فرمائے۔"

وُہ نوجوان میری باتوں سے مطمئن ہو کر چلا گیا۔ پھر اُس نے اس سلسلے میں ایک حرف بھی نہیں کہا۔

اُس نوجوان نے بڑی محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اب وُہ اچھی زندگی گزار رہا ہے۔

قرض کی ادائگی

میرے ایک بزرگ فقیہ سیّد سعیدالدّین مرحُوم ایک زمانے میں سینیر سب جج تھے اور اُس نواح کے مُسلمانوں، ہِندُوؤں اور سِکھّوں

میں یکساں طور پر ہر دلعزیز تھے ۔ جن لوگوں سے اُن کے گہرے روابط اور مراسم تھے، اُن میں ایک سکھ پولیس سپرنٹنڈنٹ سردار سنت سنگھ بھی تھا۔ وُہ اُن کے پاس اکثر آتا جاتا رہتا۔ فقیر سیّد سعیدالدّین ملازمت ہی کے زمانے میں بیمار ہُوئے اور بیماری نے اِتنی شدّت اِختیار کی اور اِس قدر طُول کھینچا کہ وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے۔

سردار سنت سنگھ اس وقت غالباً لاہور میں نہ تھے۔ چند ماہ بعد لاہور واپس آئے اور فقیر سعیدالدّین مرحُوم کے مکان پر جاکر پُرسا دیا اور اُن کے بچّوں کو بلا کر تسلّی آمیز الفاظ کہے۔ پھر سردار جی نے ایک ہزار روپے اُن کو دیے۔

بچّے حیران تھے کہ یہ روپے اُن کو کس مد میں دِیے جا رہے ہیں۔ سردار سنت سنگھ نے کہا ـــــ

”یہ روپیہ میں نے تمھارے مرحُوم باپ سے اُدھار لیا تھا، جس کا علم صرف اُنھیں اور مجھے تھا۔ اب میں یہ امانت واپس کر رہا ہُوں“۔

دیانت دار تاجر

میں سرکاری فرائض انجام دینے کے سلسلے میں ہندوستان کے مُختلف علاقوں اور شہروں کا دورہ کرتا رہتا تھا ـــ ایک بار مجھے

ریاست میسور جانا پڑا۔ سیر و سیاحت کے اعتبار سے یہ نہایت ہی خوب صورت اور قابلِ دید علاقہ ہے۔ سڑکیں کشادہ اور مصفّا۔ جگہ جگہ باغات اور سبزہ۔ خاص طور سے میسور کے برقی فوّارے تو اپنا آپ ہی جواب ہیں۔ سر مرزا محمد اسمٰعیل، دیوان ریاست میسور، کے شوقِ تعمیر اور خوش ذوقی نے میسور کو سیر گاہ بنا دیا۔

مَیں وہاں کا چڑیا گھر دیکھنے کے لیے گیا تو شیر کی کھال مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے اسے خریدنا چاہا۔ چڑیا گھر کے نگران نے کہا ـــــ

"یہاں ایک ڈچ تاجر ہے (Van-Ingen)، جو اس قسم کی کھالیں تیار کرنے اور انھیں بیچنے کا کاروبار کرتا ہے۔"

میں نے اُس تاجر کی فیکٹری کا پتہ بھی دریافت کر لیا اور چڑیا گھر سے سیدھا اُس کی فیکٹری پہنچا۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ آج اتوار ہے اور اتوار کے دن فیکٹری بند رہتی ہے۔ شیر کی کھال خریدنے کا شوق مجھ پر بُری طرح سوار تھا۔ میں اُس تاجر سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا۔ فیکٹری سے اُس کے مکان کا رُخ کیا، جو وہاں سے زیادہ دُور نہ تھا۔ اُس ڈچ تاجر نے مُلاقات میں بڑے تپاک کا مظاہرہ کیا۔ اپنی شاندار اور ہر طرح کے اسباب آرائش سے مُزیّن کوٹھی میں خندہ پیشانی کے

ساتھ بٹھایا اور چائے پلائی۔ پہلے رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے اپنے آنے کی غرض بیان کی کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہُوں۔ اِتنا طویل سفر بار بار نہیں ہو سکتا۔ شیر کی کھال خریدنا چاہتا ہُوں۔ کیا آپ کھال مہیّا کر سکیں گے؟

اُس نے جواب دیا: میرے پاس فروخت کے لیے شیر کی کوئی کھال اِس وقت موجود نہیں ہے۔ چونکہ آپ بہت دُور سے آئے ہیں۔ آپ کے شوق کے مدِّنظر میں آپ کو اپنی فیکٹری دکھانا چاہتا ہُوں۔

ہم وہاں سے فیکٹری پہنچے اور ایک بڑے سے ہال میں داخل ہُوئے تو وہاں نوّابوں، راجوں اور اُونچے درجے کے انگریز افسروں کے شکار کیے ہُوئے جانوروں کی بہت سی کھالیں نظر آئیں۔ متعدّد کھالوں میں گھاس پھُوس، نمدہ اور رُوئی وغیرہ بھر کر اِس طرح رکھّا گیا تھا کہ مرے ہُوئے جانوروں کی کھالوں پر زندہ جانوروں کا دھوکا ہوتا تھا۔ ایسا محسُوس ہُوا جیسے میں کسی عمارت میں نہیں، جانوروں کے بَن اور شیروں کے کچھار میں آ گیا ہُوں۔ واقعی وہ تاجر اپنے اِس فن میں مشّاق اور کامل تھا۔ میں اُس کے آرٹ کا کمال دیکھتا جاتا تھا، مگر ساتھ ہی اپنے لیے کھال خریدنے کا ذکر بھی کسی نہ کسی عنوان سے کر دیتا۔

میرے ہمراہ میرے ایک عزیز بھی تھے، جو فوج میں کپتان تھے۔

اور میرے ماتحت ہونے کی وجہ سے دَوروں میں اکثر میرے ساتھ رہتے۔
اُنھوں نے پنجابی زبان میں مجھ سے کہا ـــــــ

"آپ اِس پر کھال کی خریداری کے لیے بار بار زور دے رہے ہیں۔ اگر اس نے واقعی کوئی کھال دکھا دی اور اُس کی قیمت اِتنی زیادہ ہُوئی کہ اُسے ہم ادا نہ کر سکے تو بڑی شرمندگی ہوگی۔ وہ تاجر دل ہی دل میں کہے گا کہ میاں! شیر کی کھال کا اِتنا شوق رکھتے ہیں، مگر پاس پلّے اِتنا بھی نہیں ہے کہ ہرن کی کھال کے بھی دام دے سکیں۔ بہتر ہے، اِن میں سے صرف ایک کھال کے بارے میں اُن سے دریافت کریں کہ اگر یہ کھال بِکنے کے لیے ہوتی تو کس قیمت پر دی جاتی۔ اِس طرح کھالوں کی قیمتوں کا اندازہ ہو جائے گا۔"

چُنانچہ مَیں نے ایک کھال پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا ـــــــ

"اگر یہ فروخت کے لیے ہوتی تو آپ کتنی قیمت طلب کرتے؟"

تاجر نے کہا: "چھ سو روپے"۔

اِس پر میرے عزیز نے میری طرف دیکھتے ہُوئے اشارہ کیا کہ ہاں اِتنی رقم تو موجود ہے۔ اِتنے میں وُہ تاجر ہمیں ٹھہرنے کا اشارہ

کر کے ایک طرف چلا گیا ــــــ اور پانچ سات منٹ کے بعد ایک کھال لے کر آیا۔ مَیں نے بڑی ہی پُرشوق نظروں سے کھال کی طرف دیکھا۔ تاجر نے کہا ــــــ "آپ اِتنی دُور سے آئے ہیں۔ شیر کی کھالوں کے بہُت شوقین بھی ہیں۔ آپ خالی ہاتھ جاتے تو ملول و دِلگیر ہوتے۔ اِس لیے میں خاص طور سے یہ کھال آپ کے لیے لایا ہوں"۔

شیر کی یہ کھال ایک نظر میں بالکل ویسی ہی معلوم ہوتی تھی، جس طرح کی کھال کی قیمت ہم معلوم کر چکے تھے۔ وُہی سائز، ویسا ہی رنگ رُوپ!

"یہ کھال پیک کرا دیں۔ مجھے پسند ہے"۔

میں نے یہ کہتے ہُوئے چھ سو روپے کے نوٹ اُس تاجر کے ہاتھ پر رکھ دیے اُس نے نوٹ گنے اور ساڑھے تین سَو روپے واپس کرتے ہُوئے بولا:

"جناب! جس کھال کی قیمت آپ نے معلوم کی تھی،
وہ بے شک چھ سو روپے ہی کی تھی، لیکن یہ کھال جو آپ
لے جا رہے ہیں، صرف ڈھائی سو روپے کی ہے"۔

میں نے باقی نوٹ واپس لے لیے۔ اِس واقعے کو بائیس سال ہونے کو آئے، مگر اُس تاجر کی دیانت کا اثر اب تک دل و دماغ پر باقی ہے۔ سچّی بات یہ ہے کہ دیانت ایک ایسا سکّہ ہے، جو کبھی پُرانا نہیں ہوتا۔

ممتاز حسن کی لائبریری

جناب ممتاز حسن کی شخصیت سرکاری اور علمی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ نیشنل بنک آف پاکستان کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہونے کے علاوہ درجنوں سرکاری و نیم سرکاری کمیٹیوں، ادبی و تحقیقی انجمنوں اور علمی اداروں کے سربراہ بلکہ رُوحِ رواں ہیں۔ میرے اُن کے درمیان ذاتی شناسائی کا آغاز قیامِ دہلی کے دوران ہُوا تھا، جب وہ بھی سرکاری ملازمت میں تھے اور میں بھی۔ لیکن علمی تحقیق و جستجو اور تصنیف و تالیف کے موضوعات پر کھُل کر باتیں کرنے کا موقع مجھے کراچی میں اپنی کتابیں مرتب اور شائع کرنے کے دوران میں ملا ــــــ میں نے اُن کی علم دوستی اور ادب نوازی کی شہرت پہلے سے سُن رکھی تھی اور اُن کی شخصیت اور ذوقِ علم و ادب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار "روزگارِ فقیر" جلد دوم میں بھی کر چکا ہُوں، لیکن یہاں اُن کی اِس خوُبی اور خصوصیت کا ذکر مقصود ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اُسی نے اُن کی شخصیت کو منفرد اور اِنتہائی پُرکشش بنا دیا ہے ــــ وہ ہے ــــ کتابیں جمع کرنا!

اُن کا مطالعہ اِس فیشن زدہ ماحول اور سستی شہرت کے زمانے میں بہت سے اہلِ علم کے لیے قابلِ رشک ہے۔ اردو، پنجابی،

انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں میں عبور رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے فرنچ بھی سیکھی ہے۔ خداداد قوّتِ حافظہ کے مالک ہیں۔ شعروشاعری کا ذکر چھڑ جائے تو ایک ہی نِشست میں فردوسی، حافظ، مولینا رُوم، امراء القیس، مُتنبّی، غالب، اقبال، گوئٹے اور شکسپیئر کے منتخب اشعار سُناتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کے اِس ذاتی جوہر کا تعلق مطالعے سے ہے، لیکن اُن کا ذوق صرف مطالعے تک محدود نہیں۔ کتابیں جمع کرنے کی ہر ممکن سعی اور جستجو نے اس کے حسن و لطافت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

اسی ذوق کی بدولت ساری زندگی مسلسل جد و جہد کر کے، انھوں نے ایک لائبریری قائم کی ہے۔ اگرچہ کتابوں کی ایک خاصی تعداد وہ اپنی مرحوم لڑکی کے نام پر پنجاب پبلک لائبریری کو نذر کر چکے ہیں، لیکن جو ذخیرۂ کتب اُن کے پاس موجود ہے، وہ کسی طرح ایک گراں قدر اور اچھّی لائبریری سے کم نہیں۔

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری تو بین الاقوامی شہرت کی مالک ہے، مگر شخصی اور ذاتی کتب خانوں میں حیدرآباد دکن کے نواب سالار جنگ اور نواب سرامین جنگ، یُو-پی کے مولوی سُبحان اللہ گورکھپوری اور نواب صدریار جنگ، مولینا حبیب الرحمٰن شروانی کے کتب خانے بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ممتاز حسن صاحب کے

کتب خانے نے کراچی میں انھیں لائبریریوں کی چھوٹے پیمانے پر یاد تازہ کر دی ہے۔ علم و ادب کے ہر موضوع پر مختلف زبانوں میں کتابیں، وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ کہ بہت سی کتابوں کے پہلے ایڈیشن کے نسخے موجود ہیں۔ متعدّد کتابوں پر مصنّفین کے دستخط ثبت ہیں۔ جو کتابیں Out of Print ہیں، اُن کو اصل نسخوں سے فوٹوسٹیٹ کرا کے محفوظ کر لیا ہے۔ بعض نادر مخطوطات بھی ہیں۔ ان کتابوں کے جمع کرنے میں نہ جانے کتنا وقت اور روپیہ صرف ہُوا ہوگا۔ پھر اُن کا احتیاط اور سلیقہ سے رکھنا، کتنی محنت اور دردِ سری چاہتا ہے۔ جب بھی کوئی نئی کتاب اُنھیں مل جاتی ہے تو اُن کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ غیر ملکوں کے دورے پر جاتے ہیں تو واپسی پر نایاب نئی یا پُرانی کتابیں اُن کے ہمراہ ضرور ہوتی ہیں۔ اسی طرح دانہ دانہ کر کے یہ خرمن اُنھوں نے جمع کیا ہے۔

جب میں "روزگارِ فقیر"، جلد دوم مرتّب کر رہا تھا تو اسی لائبریری کی ورق گردانی کی بدولت تصاوِیر کا ایک بڑا خزانہ میرے ہاتھ آیا۔ اقبالیات کے موضُوع پر اگر انھیں کسی مقام پر اور کسی زبان میں کاغذ کا ایک پُرزہ، مطبُوعہ یا غیر مطبُوعہ ایک ورق بھی مل سکا ہے تو اُسے ضرُور محفُوظ کر لیا ہے۔ یہ ایسا کارنامہ ہے کہ آئندہ نسلیں اِس سرچشمے سے اکتساب فیض کریں گی ——

ہمارے ہاں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنا وقت اور روپیہ اس طرح کتابوں پر صرف کرتے ہیں اور کتابوں کو دل سے زندگی کا بہترین رفیق سمجھتے ہیں ـــــ حالانکہ یہ ایسی دولت ہے کہ ایک الماری میں جواہرات ہوں اور دُوسری الماری میں کتابیں تو ایک صاحبِ ذوق کی دلچسپی کا مرکز کتابوں کی الماری ہوگی۔

علم اور علمی ذخیرے کی قدر و قیمت کا اندازہ حضرت علی مرتضیٰ کرّم اللہ وجہہٗ کے اِس قول سے بخوُبی لگایا جا سکتا ہے ـــــ کہ

''علم ایک ایسا خزانہ ہے کہ اسے جتنا خرچ کیا جائے اُس میں اتنا ہی اِضافہ ہوتا ہے ''

ایک سے زائد شادیاں

میری کراچی کی رہائش گاہ پر چند دوست آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ اتنے میں ممتاز حسن صاحب بھی تشریف لے آئے۔ تعدّدِ ازدواج کے مسئلے پر بحث چھڑی تو میرے چھوٹے لڑکے نے کہا:

"اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دے کر کیا خواتین کے یکساں حقوق کی نفی نہیں کی ہے؟"

اس سوال کا جواب ممتاز حسن نے بڑی معقولیت کے ساتھ یہ دیا ——

"برخوردار! تم اگر دُنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ کرو تو اندازہ ہوگا کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جس نے دُوسرے مظلوم طبقوں کی اعانت و سرپرستی کے ساتھ ساتھ عورت کا مقام بھی اتنا بلند کیا ہے کہ تاریخ میں پہلے کبھی نظر نہیں آتا۔"

موجُودہ معاشرے میں عَورت کو کیا حیثیت دی گئی ہے، یہ ایک علیحدہ موضُوع ہے۔ جس پر یہاں بحث کا موقع نہیں ہے —— لیکن ایک بات نفسِ مضمُون سے براہِ راست متعلّق ہے اور شاید

اُسے بطورِ توضیح یہاں بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ میں نے اِس بحث میں حصّہ لیتے ہُوئے کہا ——

جہاں تک میرے ذاتی مطالعے اور غور و فکر کا تعلق ہے، میں یہی عرض کروں گا کہ قرآنِ کریم میں ہر جگہ اور ہر معاملے میں اِنسانی فطرت کو سامنے رکھّا گیا ہے اور اُس نے تعدّدِ ازدواج کی اجازت دے کر کوئی ایسی بات نہیں کی، جس پر عقلی، عملی، فطری یا اخلاقی اعتبار سے عمل کرنا ممکن نہ ہو —— مثال کے طور پر آپ کی زندگی ایسے حالات اور کیفیات سے دوچار ہوجاتی ہے کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود آپ کسی کی مَحبّت میں گرِفتار ہوجاتے ہیں یا دُوسری شادی کی خواہش آپ کے دل و دماغ میں اِس قدر شدّت اِختیار کرجاتی ہے کہ جذبات آپ کی عقل و فہم پر بُری طرح حاوی ہونے لگتے ہیں۔ ایسی صُورت میں اِسلام نے عورت کے جسم کی تقدیس کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ آپ اُس وقت تک اُسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے جب تک اُس سے باقاعدہ نکاح کرکے اُس کی زندگی کی تمام ذمّہ داریاں قبُول نہ کرلیں اور اُس کی ضرُوریات کا بوجھ پُوری طرح نہ اُٹھالیں۔ اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ آپ کا وقتی جذبہ خواہ کتنا ہی شدید ہو، اِسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ آپ عورت کو کھلونا سمجھ کر حاصل

کرلیں اور جب دل بھر جائے تو اُس کھلونے کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیں ــــــ

گویا ایک سے زیادہ شادی، سہولت اور آسانی کا کام نہیں ہے، زندگی بھر کے لیے ایک ٹھوس معاہدے اور بھاری ذمّہ داری کا کام ہے اور عورت کو حاصل کرنے کا مطلب اپنے آپ کو ایک بھاری ذمّہ داری کا پابند کرنا ہے۔

جہاں تک اِس سوال کا تعلّق ہے کہ ــــ "چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے" تو یہ تعداد خواہ کچھ بھی مقرّر کی جاتی، ــــــ موضُوعِ بحث بن سکتی تھی۔ بحث تو اِن مفرُوضات پر بھی ہو سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو دو آنکھیں دی ہیں، کیا چار آنکھیں نہیں دی جاسکتی تھیں تاکہ دو آنکھیں خراب ہو جائیں تو دُوسری دو آنکھیں اُن کی تلافی کرتی رہتیں ــــــ بحث کا مرکزی نقطہ "چار" نہیں، ایک سے زیادہ شادیاں ہیں، اور ایک سے زیادہ شادیوں کے لیے اسلام میں جو اِجازت دی گئی ہے، وہ "اِجازت" ہی ہے "حکم" نہیں ہے، لیکن اِس پر گہری نگاہ سے غور کیا جائے تو یہ "اجازت" کم ہے "رُکاوٹ" زیادہ ہے ــــــ ساری زندگی کے لیے ایک فرد کی ہر قسم کی ذمّہ داریوں کا قبول کرنا، ایسی پابندی ہے کہ اس کے تصوّر سے ہی بہت سوں کا وقتی عشق کافور ہو سکتا ہے!

ان پڑھ مُلازم

میرا زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ ان پڑھ اور جاہل آدمی بھی بعض وقت ایسی اچھّی، کام کی اور قیمتی بات کہہ دیتا ہے کہ اُس میں ساری زندگی کا فلسفہ یا لاجواب کر دینے والا کوئی نکتہ مضمر ہوتا ہے۔

آج کل میرے یہاں ایک پُرانے خاندانی مُلازم کا نوجوان لڑکا رہتا ہے۔ دُوسرے نوکروں کی طرح اِس لڑکے کو نہ تو ذمّہ داری کا اِحساس ہے نہ کسی قِسم کی کوئی فکر اور پروا ہے۔ طبیعت میں حد درجے کا لااُبالی پن ہے ——— مگر اس کے ساتھ ہی بلا کا ذہین اور حاضر جواب ہے۔

ایک دِن مجھ سے کہنے لگا کہ صاحب! میں نے لقّا کبوتروں کا ایک جوڑا پال رکھّا ہے۔ دونوں اِتنے خوب صورت اور صحت مند ہیں کہ آپ دیکھیں گے تو بہُت خوش ہوں گے۔ میں نے کہا: اچھّا! کسی دِن اپنے کبُوتر مجھے دکھانا ———

دُوسرے دِن وُہ صبح سویرے کبوتروں کا جوڑا لے کر میرے پاس آیا۔ مجھے کبُوتروں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے، لیکن یہ کبوتر واقعی دیکھنے کی چیز تھے ——— حسین، پُھرتیلے اور غیر معمُولی طور پر صحت مند ——— قدرت نے اِن کبُوتروں کی

بناوٹ کچھ ایسی رکھی ہے کہ لفتا کا سر اُس کی دُم سے مِلا ہوتا ہے

مجھے دفتر جانا تھا۔ اِس لیے میں نے اُسے ہدایت کی کہ وہ کبوتر کا جوڑا لے کر گاڑی میں بیٹھ جائے۔ دفتر پہنچ کر اُس نے جوڑے کو زمین پر رکھ دیا۔ کبوتر بڑی اکڑفوں کے ساتھ غٹرغوں کرنے لگے۔ سب لوگ اُنھیں حیرت اور مسرّت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ چند زمیندار وہاں سے گزر رہے تھے۔ اِن کبوتروں کی چال ڈھال کو دیکھ کر وہ ٹھہر گئے اور بہت دیر تک کھڑے رہے۔ پھر اُن میں سے ایک نے نوجوان ملازم سے سوال کیا ——

"اِن کی گردن تو دُم سے ملی ہوئی ہے۔ پھر دانہ کیسے کھاتے ہیں؟"

اُس نوجوان نے برجستہ جواب دیا ——

"حضرت! گردن چاہے کتنی ہی ٹیڑھی ہو، پیٹ بھرنے کے لیے سیدھی کرنی پڑ جاتی ہے۔"

زمیندار لاجواب ہو گئے اور جس نے بھی سُنا، اُس کی حاضر جوابی کی تعریف کی کہ جاہل ہوتے ہوئے ایسی بات کہی ——

اُس کی حاضر جوابی کا ایک اور واقعہ سُنیے ——

اُسے فیکٹری میں کام پر لگایا گیا۔ ایک دن وہاں سے آیا اور شکایت کی کہ فرم کے بعض ملازمین ٹنکی سے تیل نکال لیتے ہیں

اور اُس تیل کو بازار میں بیچ دیتے ہیں۔ میرا چھوٹا لڑکا قریب ہی بیٹھا تھا۔ یہ سُنتے ہی اُس نے کہا ـــــ

"کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ ٹنکی میں سے
تیل کیسے نکالا جاسکتا ہے!"

مُلازم نے مجھے مخاطب کرتے ہُوئے جواب دِیا ـــــ

"میاں صاحب! اِن کو بتائیے کہ لوگ تو
مٹّی میں سے تیل نکال لیتے ہیں۔ یہ چھوٹے
صاحب ٹنکی کی بات کرتے ہیں"۔

اِسی ملازم کا ایک اور واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں؛ ایک بار قریب کی آبادی میں ایک عورت کا قصّہ بہُت مشہُور ہُوا۔ اُس کا رنگ سُرخ و سپید تھا، نوجوان اور صحتمند تھی۔ خاوند کو ناپسند کر کے چھوڑ دیا اور اُس کے گھر سے بھاگ کر یہاں آگئی۔ خاوند نے تھانے میں رپٹ درج کرا دی اور پولیس نے اُس عورت کو یہاں آ کر گرفتار کر لیا۔ میری بیوی نے اِس مُلازم سے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سُنا ـــــ اور چونکہ وُہ اُسے دیکھ بھی چُکا تھا، اِس لیے اُس سے دریافت کیا ـــــ

"کیا وہ عورت واقعی خوب صورت ہے؟"

مُلازم نے فوراً جواب دیا ـــــ

"بی بی جی! سؤر کا رنگ اگر سفید ہو،
تو وہ خوب صورت نہیں کہلاتا ——!"

مجھے عرصۂ دراز سے یہ عادت ہے کہ رات کو سونے سے پہلے پاؤں دبواتا ہوں اور پاؤں دبانے والوں سے دلچسپ باتیں اور قصّے کہانیاں سنتا رہتا ہوں، اِس طرح دن بھر کی دماغی تکان دُور ہو جاتی ہے۔ ایک رات اُس مُلازم کی ڈیوٹی تھی۔ میں بستر پر دراز تھا۔ اُس نے پاؤں دبانا شروع کیے —— میں نے اُس سے کہا ——

"ہاں! تو اب کوئی جھوٹی کہانی سناؤ"۔

اُس اَن پڑھ نوجوان نے بڑے اِطمینان اور اِعتماد سے جواب دیا ——

"میاں صاحب! کہانی تو ہمیشہ جھوٹی
ہی ہوتی ہے۔ سچّا تو واقعہ ہوتا ہے"۔

میں اُس کی اِس حاضر جوابی پر سوچنے لگا کہ بہت سے بچّوں اور نوجوانوں کی ذہانت اور قابلیّت، غُربت اور افلاس کے ہاتھوں دب کر رہ جاتی ہے اور تعلیم کا فقدان اُنھیں دنیا میں ترقّی اور ناموری کے مواقع سے محرُوم کر دیتا ہے۔

انگریز کا زوال

انگریز کا زوال اب ایک تاریخی واقعہ اور حقیقت بن چکا ہے، لیکن ایک زمانہ تھا کہ ہم خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ انگریزی اقتدار جس کے حدودِ حکومت میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا؛ تاریخ کا ایک بے جان ورق بن کر رہ جائے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ برِّصغیر ہند، جنوب مشرقی ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں برطانیہ کے جھنڈے لہراتے تھے، مگر انقلابِ زمانہ نے اِن جھنڈوں کو ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا۔ بلکہ ان کی دھجّیاں بکھیر کر رکھ دیں!

ایک صحبت میں میرے کرم فرما میاں عبدالحی مرحوم وزیرِ تعلیم پنجاب نے کہا تھا کہ ــــــ

"وہ نسلیں خوش قسمت ہوں گی، جو انگریز کا زوال دیکھیں گی۔"

آج اُن کی اِس بات کا خیال آتا ہے تو سوچتا ہُوں کہ میاں صاحب اگر صرف پانچ سال اور زندہ رہتے تو اپنی آنکھوں سے انگریز کا زوال دیکھ لیتے! برِّصغیرِ ہند میں انگریزی حکومت کا جس ڈرامائی انداز میں خاتمہ ہُوا، وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن مجھے زمانے کے اِس عظیم انقلاب اور تغیّر کا صحیح احساس اُس وقت ہُوا جب ۱۹۵۴ء میں مجھے اِنگلستان جانے کا اِتّفاق ہُوا۔

میں صبح سویرے اپنی قیام گاہ سے باہر آیا تو فٹ پاتھ پر بیٹھے ہُوئے ایک انگریز نے بُوٹ پر پالش کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ میں بُوٹ پالش کے معاملے میں فوجی ملازمت کے زمانے سے بڑا مُحتاط ہُوں۔ لیکن ایک فوری اِحساس اور پوشیدہ جذبے نے خود بخود میرے قدم اُس کی طرف بڑھا دیے اور میں نے سیدھے پاؤں کا بُوٹ اُس کے سامنے کر دِیا۔ وہ بُوٹ چمکانے میں مصرُوف ہو گیا۔ اُس انگریز کی نگاہ میرے بُوٹ کی ٹو پر تھی اور میری نظر اُس کے خطِ پیشانی کو پڑھ رہی تھی، جس پر لکھا ہُوا تھا ــــــ

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

میں سوچنے لگا ——— کہ وہ بھی کیا دن تھے کہ انگریز قوم کے عُروج و اِقتدار کی کوئی حد و اِنتہا نہ تھی۔ ہر طرف اسی قوم کا دور دورہ ——— اُس کے ابرُو پر بل پڑتے تھے تو حکومتوں کے زوال کی علامت بن جاتے تھے ——— وہ کمال اور آج یہ زوال کہ انگریز قوم کا دنیا کی سیاست میں کوئی مقام نہیں رہا۔ اُس کی عظمتیں سرنگوں ہیں، اور اُس کی شوکت و اجلال کے ستارے خزاں رسیدہ پتّوں کی طرح منتشر ہو چکے ہیں۔ بہرحال وہ پالش کر چکا تو میں نے اُسے اُجرت دی اور اطمینان و مسرّت کا سانس لیا۔ جیسے میری قومی حمیّت کو تسکین مِل گئی ہو ———!

اُس وقت تاریخ کے کتنے ورق خود بخود نگاہوں کے سامنے آئے اور فلمی مناظر کی طرح گزرتے چلے گئے ——— ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت سے لے کر شہنشاہی تک کے عُروج کا نقشہ ——— سلطان ٹیپو شہیدؒ کا معرکۂ حق و باطل ——— ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ——— ہندوستان کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی اور رنگون میں اُن کی حسرت ناک موت ——— برطانوی حکومت کا شباب اور پھر اُس کا زوال بلکہ خاتمہ ———!

سوچتا ہوں کہ یہ نسل صرف اِس لحاظ سے اہم نہیں ہے کہ اس

نے انگریز کا زوال دیکھا ہے بلکہ اس نسل نے تغیّرات و حوادث کے ماحول میں آنکھیں کھولی ہیں اور دُنیا کے اِتنے انقلاب اور اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں کہ شاید ہی کسی دُوسری قوم اور نسل نے دیکھے ہوں۔ اِس نصف صدی میں دُنیا کا کوئی گوشہ اِضطراب و انقلاب سے محفُوظ نہیں رہا۔ کس کس فرماں رُوا کا تخت اُلٹ گیا۔ کیسے کیسے سروں سے تاج چھِن گئے۔ تمدّن و تہذیب کے کتنے نقش بنے اور بگڑ گئے۔ کتنے مسائل میں دُنیا کا زاویۂ نگاہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ آج زندگی کے جادۂ منزل میں راقم الحروف کے ہم سفر ہیں، اُن پر آنے والی نسلیں رشک کریں گی کہ اُنھوں نے ——

علاّمہ شبلی نعمانیؒ، مولانا حالیؒ، شیخ الہند مولینا محمُود الحسنؒ، مولینا ظفر علی خاںؒ، علاّمہ اقبالؒ، سر عبد القادر، قائدِ اعظم محمّد علی جناحؒ، مولینا محمّد علیؒ شوکت علیؒ، نواب بہادر یار جنگؒ، سر سکندر حیات خاںؒ، شہیدِ ملّت خان لیاقت علی خاںؒ، اُبو الکلام آزاد، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو جیسی عظیم شخصیّتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اور اُن کی آوازیں اپنے کانوں سے سُنی ہیں۔ گویا ——

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ!

موجُودہ نسل نے اپنے دور میں یہ بھی دیکھا ہے ——

○ ترکی خلافت کا خاتمہ اور مصطفےٰ کمال پاشا کا عرُوج۔

- رُوس میں شہنشاہیت کا زوال اور اِشتراکیت کا عمل دخل۔
- شاہ امان اللہ خاں کا تختِ حکومت چھوڑ کر یورپ کی راہ لینا
بچّہ سقّہ کی شش ماہہ حکومت ۔ پھر اُس کا تیا پانچہ اور نادر خاں کا ملک افغانستان پر تسلّط ۔
- شاہ حسین شریفِ مکّہ کی حکومت کا خاتمہ اور سلطان ابنِ سعُود کا فرماں رَوائے حجاز بننا ــــــ
- پہلی اور دُوسری جنگِ عظیم کا ہولناک آغاز اور حسرتناک انجام
- ہٹلر، مسولینی اور اسٹالن جیسے بڑے آمروں کا عروج و زوال۔
- متّحدہ ہندوستان کا انگریز کے تسلّط سے آزاد ہونا ۔
- دُنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت ــــــ پاکستان ــــــ کا قیام ــــــ
- برِّ صغیر ہند میں لاکھوں انسانوں کا قتلِ عام، ہجرت اور جلاوطنی ــــــ
- مصر میں بادشاہت کا خاتمہ اور انگریزی استبداد کا دیس نکالا ــــــ
- انڈونیشیا کی آزادی اور ولندیزی حکُومت کا خاتمہ ۔
- عراق، شام، یمن اور کتنے ہی دُوسرے ملکوں میں حکومتوں کا انقلاب اور خونیں حادثے ۔

○ الجزائر میں فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ اور بعض دُوسرے خطّوں میں جمہُوری حکومتوں کا قیام اور مغربی استبداد کا ڈراپ سین
○ چین میں کمیونسٹ انقلاب اور علاّمہ اقبالؒ نے جو کہا تھا ؛

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

اِس حقیقت کا بھرپور مشاہدہ ——
○ ہندوستان کے عظیم راہنما گاندھی جی، وزیرِ اعظم پاکستان لیاقت علی خاں اور صدرِ امریکہ مسٹر جان۔ ایف کینیڈی کا قتل۔
○ فلَسطین کی تقسیم اور اِسرائیلی حکومت کا قیام۔
○ جرمنی اور جاپان کا زوال۔
○ برطانیہ میں چرچل کا تاریخی زمانہ۔ اس کا عرُوج اور اختتام۔
○ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جمّوں وکشمیر کے مسئلہ پر زبردست جنگ اور سیاسی معرکہ آرائی۔ صدیوں کے بعد مسلمانوں میں شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد کی نمُود۔ علاّمہ اقبالؒ کے اس خواب کی روشن تعبیر ——

ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بڑی زرخیز ہے ساقی!

○ سائنس کی معجزنما ایجادات اور تمدّن وتہذیب کی بوقلمونیاں اور رنگ آرائیاں۔ برقی رو، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلی وژن،

ہوائی جہاز، راکٹ، مصنوعی سیارے، زمین اور چاند کے درمیان انسانی عقل و دانش کے ذریعے رابطہ اور ایسے ہی دُوسرے کامیاب سائنسی کمالات۔

یہ اور اِس قسم کے دُوسرے متعدد غیر معمُولی واقعات اور تاریخی کوائف سے گزر کر موجُودہ نسل یہاں تک پہنچی ہے۔ گویا حوادث، واقعات، ہنگامے اور خُونیں اِنقلابات اِس نسل اور اس دور کی خصوصیات ہیں۔ ہم نے یہ خصُوصیات آنکھوں سے دیکھی ہیں اور آیندہ نسلیں انھیں تاریخ کے صفحات میں پڑھیں گی ——

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَان وَیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام!

شہادت

پاکستان اور ہندوستان کی حالیہ جنگ میں میرے ایک قریبی عزیز بریگیڈیر محمّد احسن شامی بھی شہید ہوگئے۔ اِس واقعے کی اِطّلاع ملنے پر ہم لوگ شامی شہید کی خُوبیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ میرے ایک ایسے کرم فرما دوست بھی اِتّفاق سے موجُود تھے، جن کی مذہبی مسائل پر وسیع نظر ہے۔ ایک صاحب نے کہا ——

"سوال یہ ہے کہ کسی کی شہادت پر عزیزوں

اور دوستوں کا آنسو بہانا اور غم کرنا مناسب ہے یا
نہیں ـــــ کیونکہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ شہید
زندۂ جاوید ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اُسے
بلند مرتبے ملتے ہیں"۔

اُنھوں نے کسی تامّل کے بغیر فرمایا ــــ یہ انسان کا فطری
تقاضا ہے، جسے روکا نہیں جاسکتا ــــ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے
ایک مثال ہے جس سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے ؛

فرض کیجیے، آپ کا کوئی عزیز بہت بڑے عہدے پر فائز
ہوکر دُنیا کے کسی دُور دراز مُلک میں طویل عرصے کے لیے تعیّنات
ہوکر جاتا ہے۔ جب وُہ رُخصت ہونے لگتا ہے تو اِس عارضی
جُدائی پر آپ مغمُوم ہوجاتے ہیں اور آنکھیں پُرنم! اِس کا مطلب
یہ ہُوا کہ جُدائی چاہے عارضی ہو یا مستقل، انسان کا اُس سے متاثر
اور ملول و دل گرفتہ ہونا بشری تقاضا ہے ــــ

جہاں تک "شہادت" کی لفظی تعبیر کا تعلّق ہے، اس کا مطلب
قرآنِ کریم نے یہ بتایا ہے کہ اسے "مُردہ" نہ کہو ــــ اللہ تعالیٰ
کے یہاں وہ زندہ ہے، اسے رِزق دیا جاتا ہے، لیکن تم (اس
زندگی کی کیفیت کو) سمجھ نہیں سکتے۔

اس گفتگو کے حرفِ آخر کے طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارا جانا دراصل اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اُس کی خلاقیت کی "شہادت" ہے ــــ ہم زبان سے دیتے ہیں، اور شہدا اپنی شہ رگ کے لہُو سے!

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ندامت اور انکساری

ایک دوست سے گفتگو کرتے ہُوئے، بے اختیار میرے منہ سے یہ فقرے نکل گئے ــــ

"کیا بتاؤں، جس وقت اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتا ہُوں تو اپنی زندگی کو ہر قسم کے گناہوں، غلطیوں اور لغزشوں سے آلُودہ پاتا ہُوں اور یہ احساس مجھے سخت مضطرب کر دیتا ہے۔ ندامت کا یہ احساس اتنا شدید ہوتا ہے جیسے دُنیا میں مجھ سے بڑا مُجرم اور گناہگار کوئی اور ہے ہی نہیں ــــ"

مخاطب کا مطالعہ وسیع اور نگاہ باریک بیں ہو تو گفتگو کا صحیح لُطف میسّر آجاتا ہے۔ میں اپنی بات پُوری کر چکا تو میرے ایک صاحبِ نظر دوست نے اس پر تبصرہ کرتے ہُوئے ایک بہت ہی قیمتی بات کہی اور وہ یہ کہ ــــ

"بھائی! جب تک آدمی اندھیرے میں
رہے، اُسے لباس کے داغ دھبّے نظر نہیں آتے۔
جب روشنی پڑتی ہے تو اُسے اپنے داغ دھبّوں
کا احساس ہوتا ہے۔"
پھر اُنھوں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہُوئے یہ سبق آموز
نکتہ بیان کیا ــــــ
"دیکھیے! جب کوئی شخص اپنے دوست یا
کسی افسر کے پاس کوئی ایسا نذرانہ یا تحفہ لے کر
جائے جو اُس کے پاس نہ ہو تو وہ اُس کی قدر کرتا
ہے اور بہت خوش ہوتا ہے۔ اِسی طرح خُدا تعالیٰ
کے خزانے میں سب کچھ ہے، سوائے اِن دو
چیزوں کے ــــــ
ایک ندامت، دُوسری اِنکساری!
اگر اِن دو چیزوں کا تحفہ بارگاہِ خداوندی
میں پیش کیا جائے تو یہ امر یقیناً اُس کی خوشنودی
حاصل کرنے کا باعث ہوگا۔"
دوست کی یہ بات سُن کر میرے دل و دماغ پر ایک عجیب
کیفیت طاری ہوگئی اور بے اِختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے!

شراب کا استعمال

آج کل کے نوجوان صحیح علمی ذوق اور مطالعے کے فقدان کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ مذہبی مسائل کے بارے میں قرآن کریم سے جواز ڈھونڈنا تو خیر ایک اچھی کوشش ہے۔ لیکن کسی ذمہ داری سے پہلوتہی کرنے کے لیے تاویلوں کا سہارا لینا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ایک دن مجھ سے ایک نوجوان نے سوال کیا کہ ــــ

"شراب قرآنِ کریم کی نظر میں حرام ہے یا نہیں ــــ؟"

میں سوال کا پس منظر سمجھ گیا کہ یہ نوجوان غلط فہمی اور تاویلوں میں بھٹک گیا ہے۔ میں نے کہا ــــ

قرآنِ کریم کا حکم اس معاملے میں بالکل غیر مبہم اور واضح ہے۔ لیکن میں تمھاری توجہ اس مسئلے کے بنیادی پہلو پر مبذول کرنا چاہتا ہوں ــــ

بُرائی اُس چیز کا نام ہے جسے انسانوں کی اکثریت بُرا سمجھے اور اس کی عام کسوٹی یہ ہے کہ انسان اپنی اولاد کو جو کام کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو، وہ اچھائی ہے اور جس کام کو کرتے دیکھ کر

افسوس اور اضطراب محسوس کرے، وہ بُرائی ہے۔

اگر تم سے کہا جائے کہ تمہاری اولاد شراب پیتی ہے تو کیا تم یہ سُن کر خوش ہو گے ــــ؟ اگر نہیں، تو پروردگارِ عالم، جس نے بنی نوعِ انسان کو ایک کنبے کی مانند پیدا کیا ہے، اپنی مخلوق کو شراب نوشی جیسی لعنت میں مبتلا دیکھ کر کیسے خوش ہو سکتا ہے؟

اگر دُنیا بھر کے اعداد و شمار حاصل کیے جائیں تو معلوم ہو گا کہ زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جو شراب نوشی نہیں کرتے۔ کم ایسے ہیں، جو شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ جہاں اور جس مذہب میں شراب (مذہبی طور پر) ناجائز نہیں ہے، وہاں اسے ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے حکومتوں نے خود قوانین بنائے ہیں اور اسے سوسائٹی کے لیے مُضر اور مہلک تصوّر کیا گیا ہے۔

قانون اُس ضابطے کا نام ہے جسے اکثریت نے اپنے لیے مُفید تصوّر کیا ہو۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اگر ایسا قانون بنایا ہو، جو سب کے لیے نفع بخش اور مُفید ہو تو اُس کی صحت و صداقت میں کیسے کلام ہو سکتا ہے ــــ! پھر اِسلام تو عین فطری مذہب ہے اور اس کا کوئی حکم انسانیت کی فلاح اور مصلحت و حکمت سے خالی نہیں ہے۔

"رِزق"

اِس لفظ کا عام مفہُوم "کھانے پینے کی اشیاء" لیا جاتا ہے ـــ
کم سے کم ہم پاکستانی اور بھارتی مسلمانوں کے ذہن میں "رزق" کا مفہُوم "خور و نوش" ہی محفُوظ ہے۔ اردُو کی مشہُور ضرب المثل ہے کہ اللہ تعالیٰ پتّھر میں بھی کیڑے کو رزق دیتا ہے۔ مجھے بھی شرُوع شرُوع میں یہی غلط فہمی لاحق ہُوئی۔ آخر کار جب مزید مطالعے کا موقع ملا تو پتہ چلا کہ ہماری زبان میں اِس کا مطلب نہایت محدُود ہے ورنہ عربی زبان میں تو ـــ

"رِزق" کا مطلب ہر وہ شے یا نِعمت ہے، جس سے ہر جان دار فائدہ اٹھا رہا ہے"۔[1]

گوشت، غلّہ، پھل پھُول، رُوئی، ریشم، چاندی، سونا، پیٹرول، یہاں تک کہ عقل، ذہانت اور ایمان یہ سب رزق ہیں۔
"رزق" کا یہ مفہُوم پڑھ کر تشنہ جستجو کو بڑی مدد ملی اور مجھ پر غور و فکر کی نئی راہیں کھل گئیں۔ یہ یقین اور محکم ہو گیا کہ قرآنِ حکیم کا ہر لفظ اور ہر نکتہ حکمت و دانش کا خزانہ لیے ہُوئے ہے۔ پھر قرآن کریم میں خداوندِ تعالیٰ کے اِس ارشاد پر غور کیا ـــ

---

[1] "المنجد"، صفحہ ۲۶۰، مطبُوعہ بیرُوت۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَھُمۡ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ.

(اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو رِزق خدا نے
تم کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرو۔)

معلوم ہُوا کہ "رزق" خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ ہم اُس کی عطا کردہ نعمتوں اور صلاحیتوں کو خلقِ خُدا کی بہتری اور راحت و آسائش کے لیے استعمال کریں۔ مثال کے طور پر، خُدا نے ہمیں جو بصارت دی ہے، اُس سے کام لے کر ہم اندھوں کو راستہ دکھائیں۔ ہمیں چلنے کے لیے پاؤں اور کام کرنے کے لیے ہاتھ دِیے گئے ہیں، ہم انھیں نیک راستوں پر اُٹھائیں، بُوڑھوں اور بچّوں، بیماروں اور معذُوروں کی مدد کریں، اللہ کی راہ میں جہاد کریں، جنازوں کو اُٹھا کر قبرستان پہنچائیں۔ اپنی قوّتِ بازو ظلم و ستم اور بے انصافی روکنے کے لیے استعمال کریں۔ ہمیں جو قوّتِ گویائی ملی ہے، اُسے بنی نوعِ انسان کی بہتری اور بھلائی اور تبلیغ و اِصلاح کے کام میں لایا جائے۔ ہمیں جو فکر و بصیرت عطا کی گئی ہے، اُسے صِرف ذاتی جاہ و حشم میں اضافے پر صَرف کرنے کی بجائے دُوسروں کی تعلیم و تربیت اور مسرّت و کامیابی کا ذریعہ بنائیں۔

گویا

جوہرِ ذاتی کو خُدا کا خاص اِنعام سمجھتے ہُوئے اِس

انعام کا کچھ حصّہ خدا کی راہ میں اُس کی خوشنودی اور
رضامندی حاصل کرنے کے لیے خرچ کیا جائے

کیونکہ

یہ اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے اور ہماری احسان شناسی کا تقاضا بھی!

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور احسان ہی تو ہے کہ اُس نے ہمیں
اِتنی بہت سی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے ——— ورنہ ہمارے
بس میں تو اِتنا بھی نہیں کہ ہم اپنے آپ کو دُرست اعضاء اور صحیح
فکر و بصیرت کے ساتھ پیدا کر سکیں۔

جو قومیں اور نسلیں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان
نعمتوں اور صلاحیتوں سے اُس کے احکامات کی
روشنی میں کام لیتی ہیں، دُنیا میں سربلند و سرفراز
ہوتی ہیں۔ اور جو اِن احکامات سے رُوگردانی اور
غفلت کی مرتکب ہوتی ہیں، قدرت اُن سے کھاد
کا کام لیتی ہے تاکہ وہ اپنے انجام کو پہنچیں اور دُنیا
میں نئی اور بہتر نسلیں وجود میں آئیں۔ کوئی قوم یا
نسل خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، قدرت کے اِس اٹل
قانون سے بچ نہیں سکتی!

ظہورِ رحمت

فروری ۱۹۶۶ء کا آغاز تھا کہ ڈاک میں ایک اجنبی مہربان کا خط موصول ہوا، جس میں لکھا تھا ــــــ

"گزشتہ ہفتے پیرس میں ڈاکٹر حمید اللہ[1] نے مجھے ایک کتاب "روزگارِ فقیر" بغرضِ مطالعہ دی ۔ آپ کا اسمِ گرامی دیکھ کر چونکا اور تصوّر نے ۵۲-۱۹۵۱ء کا زمانہ اور صحبتیں یاد دلائیں"۔

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے قابلِ فخر فرزند ہیں اور علمی دُنیا میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں، کئی کتابوں کے مصنّف ہیں، اردو تو اُن کی مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ عربی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبان و ادب کے عالم ہیں۔ وہ غالباً پہلے شخص ہیں، جنھوں نے غزواتِ رسولؐ پر نقشے اور چارٹ مرتّب کیے ہیں۔ یورپ کی کئی یونیورسٹیوں کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب موصوف توسیعی لیکچر دے چکے ہیں۔ اب سے تقریباً پندرہ سال قبل حکومتِ پاکستان کی جانب سے دستورسازی کے سلسلے میں جو اسلامی بورڈ مقرّر ہوا تھا، اُس کے وہ رکن رہ چکے ہیں ڈاکٹر صاحب موصوف برسوں سے پیرس میں مقیم ہیں۔ فرانسیسی زبان میں قرآنِ کریم

(باقی اگلے صفحے کے نیچے)

صاحبِ مکتوب نے "روزگارِ فقیر" کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے کے بعد دریافت کیا تھا کہ ——

"اس کے علاوہ آپ کی اور تصانیف بھی شائع ہُوئی ہوں تو اُن کتابوں کے نام اور مِلنے کے پتے لکھ کر بھیج دِیے جائیں۔"

مَیں اُن کے خط کا جواب لکھنے ہی والا تھا کہ چند روز بعد اُن کا دُوسرا کرم نامہ مِلا کہ ——

"ایک صاحب جو مجھ سے "روزگارِ فقیر" مطالعے کے لیے لے گئے تھے، دُوسرے دِن وہ آپ کی دُوسری کتاب "محسنِ اعظمؐ اور محسنینؓ" لے کر میرے پاس آئے۔"

راقم الحرُوف کی اِس کتاب نے صاحبِ موصُوف کو اِس قدر متاثر کیا کہ اُنھوں نے کتاب ختم کرتے ہی مجھے جو خط لکھا وہ پُرخلُوص

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۲۶)

کے ترجمے کی سعادت اور شرف اُن کے حصّے میں آیا ہے۔ یورپ کے رنگین اور عیش پروردہ ماحول میں وہ اِنتہائی سادہ اور زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اُن کی شخصیت اور کردار اسلام کا دلکش تعارُف ہے۔

جذبات اور گہرے تاثرات سے لبریز تھا ـــــــ اُن کے اِس جُملے نے، کہ ـــــــ

"اِس کتاب کو لکھ کر آپ نے آخرت کا سامان
کر لیا ہے۔"

خود راقم الحروف کے جذبات میں ہل چل پیدا کر دی۔ کسی مُسلمان کا کوئی عمل اگر اُس کی آخرت کا سامان اور زادِ راہ بن جائے، تو اور کیا چاہیے۔ فَهُوَ المُرَاد!

میں نے اپنے حافظے پر بہت کچھ زور ڈالا، مگر یاد نہ آسکا کہ صاحبِ موصُوف نے جس دیرینہ شناسائی اور معیّت کا ذکر کیا ہے، اُس کا آغاز کب اور کیسے ہُوا؟ البتّہ اُن کے خط سے جھلکتا تھا کہ وہ پاکستانی ہیں اور بہاول پور کے متوطّن ہیں! ـــــــ اُن کا نام محمّد امیر ایاز ہے، جو ۱۹۵۴ء میں ہجرت کر کے مدینۂ منوّرہ چلے گئے ہیں، اور اُس وقت سے اب تک اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس ارضِ مقدس میں فروکش ہیں۔ اعلٰیحضرت شہزادہ عبداللہ الفیصل نے جو مکتبِ خاص شارعِ ملک عبدالعزیز پر قائم فرمایا ہے، معقول مشاہرے پر وہاں اسِسٹنٹ سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اُن کے خط سے اخلاص و شرافت، بے نفسی اور للّٰهیّت کی جو خوشبو آرہی تھی، اُس سے میں بہت زیادہ متاثر ہُوا ـــــــ موصُوف نے

دیارِ حبیبؐ بلکہ پورے سعودی عرب میں اِس کتاب کی اِشاعت کے لیے پُرجوش تعاون کی پیش کش کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ـــــــ

"آپ مجھے دائمی اجازت دیں کہ بوقتِ حاضری درِ رسولؐ میں آپ کی جانب سے آپ کا سلام بارگاہِ رسالتؐ میں پیش کیا کروں اور آپ کی جانب سے عمرہ کر سکوں"۔

اِس خط کو پڑھ کر وفورِ جذبات اور شوق و مسرّت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ کس مقدّس سرزمین میں مجھ گنہگار کو کس محبّت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے ـــــــ فریضۂ حج کی ادائیگی اور زیارتِ حرمین شریفین ہر مُسلمان کی طرح میرے دل کی تمنّا، بلکہ زندگی کا مقصود رہی ہے۔ لیکن اپنی خرابیِ صحت کے باعث اِس سعادت سے اب تک محرُوم ہوں۔

میں نے اُن کو جواب میں لکھا ـــــــ

"قدرت نے مجھ پر آپ کا یہ احسان مقدّر کر رکھا تھا کہ پیرس میں "روزگارِ فقیر" اور مدینۂ منوّرہ میں "محسنِ اعظمؐ اور محسنینؓ" پڑھ کر آپ رشتۂ اخوّت کی تجدید کریں گے اور میں آپ کے توسط سے دربارِ رسالتؐ میں نذرانۂ سلام و عقیدت عرض کرنے کی دیرینہ آرزو

پُوری کرُوں گا۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے، پہلے آپ
میری جانب سے عمرہ ادا کریں پھر میرے مرحُوم والد فقیر
سیّد نجمُ الدّین، میری والدہ سیّدہ بی بی بیگم،
میری خالہ سیّدہ محبُوب بیگم اور میرے لیے حج بدل
کا اہتمام کریں ——"

موصُوف نے بڑی خُوش دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ اِس ذمّہ داری کو قبوُل فرماتے ہوُئے مجھے بواپسی ڈاک مطّلع کیا کہ وہ میری جانب سے عمرہ ادا کر چکے ہیں، اور حج بدل کے سارے اِنتظامات مکمّل کر لیے گئے ہیں —— جو حضرات حج بدل کے لیے بہ رضا و رغبت آمادہ ہوُئے ہیں، وہ مناسکِ حج ادا کرنے کے لیے ایاز صاحب کے ہمراہ مکّۂ مکرّمہ جائیں گے۔

میں نے اِس اِطّلاع پر اپنے پروردگار اور مالکؒ مولیٰ کا شکر ادا کیا کہ مجھ جیسے آلُودہ دامن کو اِس رحمت و شفقت سے نوازا جا رہا ہے۔

یہ سطور عین اُس وقت سپُردِ قلم کر رہا ہُوں، جب فریضۂ حج میں صرف دو روز باقی رہ گئے ہیں اور اِس کتاب کے شائع ہونے تک، اِنشاءاللہ تعالیٰ، حج بدل کے مقدّس مناسک اور فرائض انجام پا چکے ہوں گے۔

یہ واقعہ شاید دُوسروں کے لیے سادہ اور معمُولی ہو، مگر میرے لیے اس میں اِس قدر دلکشی اور تاثّر و جاذبیّت ہے کہ اُس کا اظہار لفظوں میں نہیں کرسکتا۔ یہ دراصل قبولیتِ دُعا اور ایک عزیز دوست کے کمالِ اخلاص و مروّت اور بے نفسی و للّٰہیّت کی داستانِ رنگین و دل نشین ہے! ـــــ ایاز صاحب جیسے دوستوں ہی کے دم سے اِس دنیا میں اخلاص و شرافت، بے غرض احسان و خیر خواہی اور صحیح قدر شناسی کی شان دار روایات قائم ہیں۔ میں جس قدر سوچتا اور غور کرتا ہُوں، اس واقعے کو "حُسنِ اتفاق" سمجھنے کے علاوہ اپنی زندگی کا سب سے اہم واقعہ اور سب سے زیادہ قیمتی تجربہ پاتا ہوں۔ محبّت و قدر شناسی کی ایسی مثالیں اور اِس طرح کے اچھّے اور سچّے دوست زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں ـــــ خداوندِ قدوس جب اپنے کسی خطادار، حقیر، بے مایہ اور گنہگار بندے کے دامنِ مراد اور دستِ دُعا کو اِنعام و مغفرت کے پھُولوں سے بھرنا چاہتا ہے تو سازگار اسباب اور ایسے محُسن انسان مہیّا فرما دیتا ہے، خود اُسی کارسازِ دو عالم کا اِرشاد ہے ـــــ

وقال ربّکم ادعونی استجب لکم۔ (سورۃ المؤمن)

(اور تمھارا رب کہتا ہے، مجھے پکارو۔ میں تمھاری (بات) قبُول کرُوں گا۔)

اور

اللہ تعالیٰ نے مجھ عاجز و درماندہ بندے کی "پکار" کو قبول فرمالیا اور اس فقیر نے اپنی آنکھوں سے اپنے مالک و آقا کے اس ارشاد اور وعدے کی صداقت کا مشاہدہ کرلیا!

الحمدُ للہ علیٰ اِحسانہٖ.

(اگرچہ "انجمن" طباعت کے آخری مرحلے میں پہنچ چکی تھی، لیکن اس واقعے کی غیر معمولی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر میں نے اسے بہرصورت کتاب میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کی۔)

کتبہٗ

جمیل احمد قریشی تنویر رقم